وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

اور جو شخص دین کا فہم دیا گیا اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی

آپ فتویٰ کیسے دیں؟

علامہ شامی رحمہ اللہ کی مشہور درسی کتاب شرح عقود رسم المفتی کا سلیس ترجمہ
ضروری وضاحت مفید عنوانات اور اکابر فقہاء اور کتب فقہیہ کا مفصل تعارف

از

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

Ph: 7224228 - 7221395

علامہ شامی رحمہ اللہ کی مشہور درسی کتاب شرح عقود رسم المفتی کا سلیس ترجمہ
ضروری وضاحت مفید عنوانات اور اکابر فقہاء اور کتب فقہیہ کا مفصل تعارف

از

حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

مکتبہ رحمانیہ
اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

نام کتاب	:	آپ فتویٰ کیسے دیں؟
مصنف	:	علامہ محمد امین بن عمر بن عابدین دمشقی شامی رحمہ اللہ
مترجم وشارح	:	حضرت العلام مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب استاذ حدیث شریف دارالعلوم دیوبند
ناشر	:	مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
مطبع	:	ریاض شہباز پرنٹنگ پریس
تعداد	:	۱۱۰۰

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۴۱۲ھ کی بات ہے، میرے بڑے لڑکے مفتی رشید احمد قدس سرہ دارالعلوم دیو بند کے دارالافتاء کے طالب علم تھے۔ انہوں نے مجھ سے علامہ شامی قدس سرہ کی شرح عقود رسم المفتی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ سبق شروع کیا گیا تو وہ تقریر لکھنے لگے۔ کتاب چونکہ خود ہی مفصل تھی اس لیے تقریر کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی، ترجمہ ہی سے کام چل جاتا تھا، اس لیے میں روزانہ سبق کا ترجمہ لکھ کر ان کو دے دیا کرتا تھا۔ وہ اس کو صاف کر لیتے اور سبق میں کوئی زائد بات آتی تو وہ اس کو بھی شامل کر لیتے اس طرح کتاب مکمل ہوگئی تو میں نے اس کی تبییض شروع کی۔ آدھا کام ہو پایا تھا کہ کسی وجہ سے سلسلہ رک گیا اور وہ مواد آنعزیز کے پاس پڑا رہا۔

۴رشوال ۱۴۱۵ھ مطابق ۶ر مارچ ۱۹۹۵ء کو آنعزیز ایک ضرورت سے مظفر نگر گئے واپسی میں ان کی گاڑی میں حادثہ پیش آیا اور تقریباً تیس آدمی شہید ہو گئے۔ ۵رشوال کو ظہر کی نماز کے بعد دارالعلوم میں ایک بڑے مجمع نے ان کی نماز جنازہ پڑھ کر قبرستان قاسمی میں حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیو بندی قدس سرہ، شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند کے پہلو میں مولا کے حوالے کر دیا۔ میں اس وقت لندن میں تھا۔ فوراً ہی مجھے فون سے اطلاع دی گئی مگر مجھے جہاز صبح دس بجے مل سکا اور میں دوسرے دن صبح دیو بند پہنچ سکا اس جانکاہ حادثہ نے چند روز کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا مگر بہت جلد مولائے کریم نے سنبھال لیا اور سابقہ حالت عود کر آئی تو سوچا کہ جو مسودہ ان کے پاس محفوظ ہے اس کی تبییض مکمل کرلوں! احباب کا بھی بہت اصرار تھا مگر میں اپنے مشاغل کی وجہ سے تکمیل نہیں کر پا رہا تھا۔ ارادہ ایک مبسوط مقدمہ لکھنے کا بھی تھا مگر اب طبیعت اس کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس لیے سوچا کہ کتاب جس حال میں ہے اسی طرح طبع کر دی جائے ان شاء اللہ یہ بھی طلبہ کرام کے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔

میں نے اس کتاب میں رسم المفتی کا اکثر جگہ توضیحی ترجمہ کیا ہے، کسی جگہ عبارت دقیق تھی

تو لفظی ترجمہ کیا ہے جہاں تشریح یا تلخیص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں وضاحت کی ہے۔ کتاب میں عناوین لگا دیے ہیں۔ کتاب میں جن علماء کا یا ان کی کتابوں کا تذکرہ آیا ہے ان کا آخر میں تعارف دیا گیا ہے اور اس کے لیے مسلسل نمبر استعمال کئے گئے ہیں۔ عربی عبارت شامل اشاعت نہیں کی ہے صرف عربی اشعار لیے ہیں، طلبہ اصل کتاب سے ملا کر استفادہ کریں سر دست شکستہ دل کے ساتھ جو کچھ بن پڑا پیش کیا جا رہا ہے۔ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ آنعزیز رحمہ اللہ کے لیے دعائے مغفرت و رفع درجات فرمائیں اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے کہ انہی کی وجہ سے یہ کتاب وجود میں آئی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَبَرِّدْ مَضْجَعَهٗ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَاجْعَلْ اٰخِرَتَهٗ خَيْرًا مِّنَ الْاُوْلٰى وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دار العلوم دیوبند
۲۷ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ: ستائش کے سزاوار وہ اللہ تعالیٰ ہیں جنہوں نے ابتدائے آفرینش ہی میں ہم پر ہدایت کے ذریعہ احسان فرمایا۔ اور محض اپنی عنایت اور اپنے کرم سے ہم کو گمراہی سے بچایا۔ اور بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل ہو ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو گمراہی سے حفاظت کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اور آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں پر جو روایت و درایت والے ہیں۔ اے اللہ! ان سب پر ایسی رحمت اور سلامتی نازل فرما جس کے لئے نہ کوئی غایت ہو نہ نہایت۔ (آمین)

فائدہ: عربی عبارت میں علامہ شامی نے براعت استہلال کے طور پر فقہ کی مشہور سات کتابوں کی طرف اور دو اصطلاحوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ براعت استہلال کے معنی ہیں کتاب کے مقدمہ میں ایسے الفاظ لانا جو مقصد کی طرف مشیر ہوں۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)۔ ہدایہ سے بدایۃ المبتدی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ فقہ کا مشہور متن ہے۔ ہدایہ اسی کی شرح ہے۔ یہ متن خود صاحب ہدایہ کی تصنیف ہے۔ اور علیحدہ بھی مطبوعہ ہے مگر عام طور پر دستیاب نہیں ہے۔

(۲)۔ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور درسی کتاب ہے۔ پورا نام الہدایۃ الی البدایۃ ہے۔ یعنی بدایۃ المبتدی کو حل کرنے کی طرف راہ نمائی۔ متن اور شرح دونوں امام علی بن ابی بکر ابو الحسن برہان الدین فرغانی مرغینانی (مرغلانی) کی تصنیفات ہیں۔ (۱)

(۳)۔ فیض سے فیض المولی الکریم علی عبدہ ابراہیم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ دو جلدوں میں فتاویٰ کی کتاب ہے اور مخطوطہ ہے۔ اس کے مصنف ابن الکرکی ہیں۔ آپ کا پورا نام ابراہیم بن عبدالرحمٰن ابو الوفاء برہان الدین الکرکی (و ۸۳۵ھ ف ۹۲۲ھ) ہے۔ کرک مشرق اردن میں ایک مقام ہے۔ آپ علامہ ابن الہمام کے تلمیذ ہیں۔ فتاویٰ کرکی سے یہی کتاب مراد ہوتی ہے۔ (شامی ج ۱ ص ۱۹۔ اعلام ج ۱ ص ۴۶)

(۴)۔ عنایہ سے العنایۃ فی شرح الہدایۃ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہدایہ کی مشہور شرح ہے اور فتح القدیر کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ اس کے مصنف علامہ اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی (و ۷۱۴ھ ف ۷۸۶ھ) ہیں۔

(۵)۔ وقایہ سے وقایۃ الروایۃ فی مسائل الہدایہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ شرح وقایہ کا متن ہے۔ اس کے مصنف تاج الشریعہ محمود ہیں۔ (۳)

(۶)۔ غایہ سے غایۃ البیان و نادرۃ الاقران کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہدایہ کی امیر کاتب کی مشہور شرح ہے۔ (۴)

(۷)۔ نہایہ سے النہایۃ فی شرح الہدایہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی ہدایہ کی مشہور شرح تین جلدوں میں مخطوطہ ہے۔ اس کے مصنف علامہ حسام الدین حسین بن علی سغناقی (متوفی ۷۱۱ھ) ہیں۔ سغناق ترکستان کا ایک شہر ہے۔ آپ حافظ الدین کبیر محمد بن محمد بن نصر بخاری کے تلمیذ اور علامہ قوام الدین کاکی صاحب معراج الدرایہ فی شرح الہدایہ اور علامہ سید جلال الدین کرلانی صاحب کفایہ فی شرح الہدایہ کے استاذ ہیں (اعلام ج ۲۔ص ۲۴۷۔ فوائد بہیہ ص ۶۲ میں حسن بن علی نام لکھا ہے۔ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۲ میں آپ کو صاحب ہدایہ کا شاگرد بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔)

(۸)۔ روایت، فن حدیث کی مشہور اصطلاح ہے۔ یہاں روایت سے مراد ''مسائل منقولہ'' ہیں۔

(۹) درایت کے لغوی معنی ہیں حیلہ سے جاننا اور اصطلاح میں مطلق دلیل کو اور دلیل عقلی کو درایت کہتے ہیں۔ (فائدہ ختم ہوا)

ترجمہ:

حمد و صلوٰۃ کے بعد، مخلوق میں سب سے زیادہ محتاج، اپنے مولیٰ کی مہربانی کا مضبوط دستہ (کڑا) تھامنے والا، محمد امین بن عمر عابدین ماتریدی حنفی......... مولیٰ اس کے ساتھ اپنی مخفی مہربانی کا معاملہ فرمائیں......... کہتا ہے کہ یہ ایک عمدہ شرح ہے، جو میں نے اپنی اس نظم کی لکھی ہے۔ جو میں نے ''قواعد افتاء'' میں مرتب کی ہے۔ اس شرح کے ذریعہ میں اس نظم کے مقاصد کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے نامانوس اور بد کے ہوئے مسائل کو قید تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ بارگاہ بے نیاز میں دست بدعا ہوں کہ وہ اس شرح کو اپنی ذات کے لیے خالص اور بڑی کامیابی کا سبب بنائیں اب میں کہتا ہوں اور ہر حال میں انہیں سے مدد کا خواستگار ہوں۔

فائدہ:

علامہ شامی رحمہ اللہ کا نام محمد امینؒ والد کا نام عمرؒ دادا کا نام عبدالعزیزؒ خاندانی لقب عابدین (بصیغہ جمع) ہے۔ آپ کا وطن دمشق ہے جو ملک شام کا مشہور شہر ہے۔ آپ کی شہرت علامہ ابن عابدین اور علامہ شامی سے ہے ولادت ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں اور وفات ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں ہوئی ہے۔ آپ نے قواعد افتاء میں جو نظم تحریر فرمائی ہے۔ اس میں ۷۴ اشعار ہیں اور اس کا نام عقود رسم المفتی ہے۔ عقود عقد کی جمع ہے جس کے معنی ہیں۔ ہار اور یہاں مراد منظومہ ہے۔ اور رسم کے معنی ہے کسی چیز کا خاکہ، علامت، معاملہ اور اصلاحی معنی ہیں۔ العلامة التي تدل المفتي على مايفتي به (شامی ج ۱ ص ۵۱) یعنی وہ نشانی جو فتویٰ دینے میں مفتی کی راہ نمائی کرے جیسے راستہ کے نشانات راہ رو کی منزل کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ پس عقود رسم المفتی کا مطلب ہے قواعد افتاء کے سلسلہ کی نظم یعنی منظوم کلام۔ پھر آپ نے خود ہی اپنے منظومہ کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام شرح عقود رسم المفتی ہے۔ یہی شرح افتاء کے طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ اور اسی کا ہم ترجمہ کر رہے ہیں مگر عام طور پر اس شرح کو بھی رسم المفتی ہی کہا جاتا ہے۔

۱۔ بِاسْمِ الْاِلٰهِ شَارِعِ الْاَحْكَامِ مَعَ حَمْدِهٖ اَبْدَأُ فِي نِظَامِيْ
۲۔ ثُمَّ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ سَرْمَدًا عَلٰى نَبِيِّ قَدْ اَتَانَا بِالْهُدٰى
۳۔ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهِ الْكِرَامِ عَلٰى مَمَرِّ الدَّهْرِ وَالْاَعْوَامِ

ترجمہ: (۱) احکام شرعیہ تجویز فرمانے والے معبود کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ ان کی حمد کے ساتھ اپنی نظم شروع کرتا ہوں۔

(۲) پھر دائمی درود و سلام ہو۔ اس نبی پر جو ہمارے پاس ہدایت لائے ہیں۔

(۳) اور آپ کے خاندان اور آپ کے معزز ساتھیوں پر۔ جب تک کہ زمانہ اور سال گزرتے رہیں۔

تشریح:

(۱)۔ پہلا مصرعہ بمنزلہ بسم اللہ ہے۔ اور دوسرا حمد۔ شارع (اسم فاعل) از شرع (ف) شرعاً للقوم: قانون بنانا۔ شریعت جاری کرنا۔ نظام (مصدر) موتی پرونا۔ یہاں بمعنی منظومہ

(نظم) ہے۔

(۲) سرمد: ہمیشہ' لَيْلٌ سَرْمَدٌ' بمعنی لمبی رات۔ سَرْمَدِیٌ: جس کی نہ ابتدا ہو نہ انتہا۔

(۳) کرام جمع کریم کی' جس کے معنی ہیں معزز آدمی۔ بلکہ ہر اچھی قابل تعریف چیز کریم کہلاتی ہے۔ مر (مصدر) گزرنا' جانا۔ باب نصر سے۔ اعوام جمع عام کی۔ بمعنی سال۔

۴۔ وَبَعْ ... مُحَمَّدُ بنُ عَابِدِيْنَ يَطْلُبُ

۵۔ تَوْفِيْقَ رَبِّهِ الْكَرِيْمِ الْوَاحِدُ وَالْفَوْزَ بِالْقُبُوْلِ فِي الْمَقَاصِدْ

۶۔ وَفِيْ نِظَامِ جَوْهَرٍ نَضِيْدُ وَعِقْدِدُرٍّ بَاهِرٍ فَرِيْدُ

ترجمہ: (۴) اور حمد وصلوٰۃ کے بعد' پس محتاج گنہگار بندہ۔ محمد بن عابدین طلب کرتا ہے۔

(۵) اپنے رب واحد وکریم کی توفیق۔ اور مقاصد کی قبولیت میں کامیابی

(اور (کامیابی) مرتب جواہر کے پرونے میں۔ اور یکتا فائق موتیوں کے ہار بنانے میں

تشریح:

توفیق کے معنی ہیں نیک کام کے اسباب مہیا کرنا اور موانع مرتفع کرنا۔ جوہر: ہیرا ہر وہ پتھر جس سے مفید چیز بنائی جائے۔ نضید: مرتب نَضَدَ (ض) المتاع: سامان ترتیب سے رکھنا۔ باہر: فائق۔ بَهَرَهُ (ف) بَهْرًا: فضیلت میں بڑھ جانا۔ فرید: یکتا' نفیس جوہر' جمع فرائد۔

ترکیب:

العبد الخ یطلب کا فاعل مقدم ہے' توفیق مفعول بہ ہے۔ الفوز کا توفیق پر عطف ہے' فی نظام کا بالقبول پر عطف ہے اور عقد کا نظام پر۔

۷۔ وَسَمَّيْتُهُ عُقُوْدَ رَسْمِ الْمُفْتِيْ يَحْتَاجُهُ الْعَامِلُ اَوْمَنْ يُفْتِيْ

۸۔ وَهَا اَنَا اَشْرَعُ فِي الْمَقْصُوْد مُسْتَمْنِحًا مِنْ فَيْضِ بَحْرِ الْجُوْد

ترجمہ: (۷) میں نے اس نظم کا عقود رسم المفتی نام رکھا ہے۔ جس کے عمل کرنے والے اور فتویٰ دینے والے محتاج ہیں۔

(۸) اور اب میں اصل مقصود کو شروع کرتا ہوں۔ بخشش الٰہی کے دریا کے فیضان سے عطیہ طلب کرتے ہوئے۔

مُسْتَمْنِحًا حال ہے۔ اشرع کی ضمیر فاعل سے۔ اِسْتَمْنَحَهُ: عطیہ طلب کرنا مجرد مَنَحَه'

(ف ض)الشیءُ: دینا عطا کرنا۔ اَلْمِنحہ: عطیہ۔

۹۔ اِعْلَمْ بِاَنَّ الْوَاجِبَ اتِّبَاعُ مَا تَرْجِيْحُهُ عَنْ اَهْلِهِ قَدْ عُلِمَا

۱۰۔ اَوْکَانَ ظَاهِرَ الرِّوَايَةِ وَلَمْ يُرَجِّحُوْا خِلَافَ ذَاکَ فَاعْلَمْ

ترجمہ: (۹) جان لیجئے کہ اس کی پیروی واجب ہے۔ جس کی ترجیح اصحاب ترجیح کی طرف سے جانی گئی ہو۔

(۱۰) یا وہ قول ظاہر روایت ہو اور نہیں ترجیح دی ہو اصحاب ترجیح نے اس کے علاوہ قول کو، پس یہ بات اچھی طرح جان لیجئے!

مرجوح قول پر نہ فتویٰ دینا جائز ہے نہ عمل کرنا:

مذکورہ اشعار کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خود عمل کرنا چاہے یا دوسرے کو فتویٰ دینا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قول اختیار کرے جس کو علمائے مذہب نے ترجیح دی ہے۔ کیونکہ مرجوح قول پر نہ تو عمل کرنا جائز ہے نہ فتویٰ دینا۔ البتہ بعض مخصوص حالات میں مرجوح قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے جیسا کہ شعر نمبر ۷۰ وا۷ میں آ رہا ہے۔

یہ مسئلہ اجماعی ہے:

اور متعدد علماء نے اس سلسلہ میں اجماع نقل کیا ہے۔ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ (۵) فتاویٰ کبریٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''زوائد الروضہ (۶) میں ہے کہ مفتی کے لیے اور عمل کرنے والے کے لیے جائز نہیں ہے کہ غور و فکر کئے بغیر دو قولوں میں سے کسی بھی قول پر یا دو وجہوں[1] میں سے کسی بھی وجہ پر فتویٰ دے دے یا عمل کرے اور زوائد کی بیان کردہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور صاحب زوائد سے پہلے ان دونوں مسئلوں میں علامہ ابن الصلاح (۷) نے اجماع نقل کیا ہے۔ اور مالکیہ میں سے علامہ باجی (۸) نے مفتی کے بارے میں اجماع نقل کیا ہے اور علامہ قرافی (۹) کے کلام سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لیے، خواہ وہ مجتہد فی المذہب ہوں یا مقلد محض جائز نہیں ہے کہ غیر راجح قول کے مطابق فیصلہ

---

[1] یہ فقہ شافعی کی مخصوص اصطلاح ہے۔ شوافع امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال کو ''روایات'' کہتے ہیں اور بعد کے مشائخ کے اقوال کو ''وجوہ'' کہتے ہیں اور احناف کے یہاں ائمہ ثلاثہ کے اقوال کو ''روایات'' اور بعد کے علماء کی آراء کو اقوال کہا جاتا ہے۔ (معارف السنن ج ۱۔ ص ۳۳)

کریں یا فتویٰ دیں۔ کیونکہ ایسا کرنا خواہش کی پیروی کرنا ہے جو بالا جماع حرام ہے۔

اور مجتہد فی المذہب کے بارے میں علامہ قرافی کی بات کا مصداق وہ صورت ہے جب دلائل میں تعارض نہ ہو' یا تعارض ہو مگر ترجیح ممکن ہو۔ اور اگر کسی مسئلہ میں دلائل ایسے متعارض ہوں کہ کسی طرح ترجیح ممکن نہ ہو تو اس وقت مجتہد مقلد کے لیے دو قولوں میں سے کسی بھی قول پر بالا جماع فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا درست ہے'' (فتاویٰ کبریٰ کی عبارت پوری ہوئی) اور امام محقق علامہ قاسم بن قُطلُوبُغَا (۱۰) اپنی کتاب تصحیح القدوری کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں کہ'' میں نے اپنے ائمہ ثلاثہ کے متبعین میں ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو خواہشات پر عمل پیرا تھے۔ یہاں تک کہ میں نے بعض قاضیوں کے منہ سے یہ بات سنی ہے کہ اس میں۔ یعنی کسی بھی قول کو لے لینے میں۔ کیا حرج ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں! خواہش کی پیروی حرام ہے اور راجح کے مقابلہ میں مرجوح کالعدم ہے اور کسی مرجح کے بغیر متعارض اقوال میں ترجیح ناجائز ہے۔''

اور ابن سید الناس یعمری (۱۱) نے کتاب الاصول میں لکھا ہے کہ:

'' جسے معلوم نہیں کہ دو قولوں میں سے اور دو وجہوں میں سے کون سا قول اور کون سی وجہ مشہور ہے تو اس کے لیے خواہش کی پیروی کرنا' اور ترجیح میں غور کیے بغیر کسی بھی قول یا وجہ پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔''

اور امام ابو عمرو بن الصلاح آداب المفتی (۷) میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

'' یہ بات جان لیجیے کہ جو شخص ترجیح میں غور نہیں کرتا اور محض اتنی بات پر اکتفا کرتا ہے کہ اس کا فتویٰ یا عمل کسی بھی قول یا کسی بھی وجہ کے مطابق ہو جائے اور وہ مختلف اقوال و وجوہ میں سے جس پر چاہتا ہے عمل کرتا ہے تو وہ نادان ہے اور خرق اجماع کرتا ہے۔''

اور علامہ باجی رحمہ اللہ (۸) نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا' مفتیوں نے اس سلسلہ میں جو فتویٰ دیا وہ باجی کے خلاف تھا۔ پھر جب باجی نے خود مسئلہ دریافت کیا تو مفتیوں نے معذرت کی کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کا واقعہ ہے۔ اور انہوں نے دوسری روایت پر فتویٰ دیا جو باجی کے موافق تھا۔ باجی کہتے ہیں کہ تمام قابل لحاظ مسلمانوں کے اجماع سے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور اصول اقضیہ[۱] میں ہے کہ:

''مفتی اور قاضی کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ مفتی حکم کی اطلاع دیتا ہے اور قاضی اس کو لازم کرتا ہے۔'' (یہاں علامہ قاسم بن قطلوبغا کی عبارت پوری ہوئی)۔

اس کے بعد علامہ قاسم (۱۰) نے نقل کیا ہے کہ:

''مرجوح روایت کے مطابق فیصلہ کرنا یا فتویٰ دینا اجماع کے خلاف ہے۔''

نوٹ: اگر مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح موجود نہ ہو تو اس کا حکم آگے شعر نمبر ۶۶ کی شرح میں آرہا ہے۔

طبقات فقہاء:

میں نے نویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں ''اہل ترجیح'' کی تصحیح کی قید لگائی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی بھی عالم کی ترجیح کا اعتبار نہیں (بلکہ جن فقہاء میں ترجیح کی اہلیت ہے انہی کی ترجیح معتبر ہے) علامہ شمس الدین احمد بن سلیمان نے جن کی شہرت ابن کمال[۲] پاشا (۱۲) کے نام سے ہے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ:

مقلد مفتی کے لیے اس شخص کا حال جاننا ضروری ہے جس کے قول پر وہ فتویٰ دے رہا ہے۔ اور حال جاننے کا مطلب محض نام ونسب اور وطنی نسبت جاننا نہیں ہے کہ محض اتنی بات بالکل بے فائدہ ہے بلکہ یہ جاننا ضروری ہے کہ مسائل روایت کرنے میں اس کا کیا مقام ہے اور مسائل کے دلائل سمجھنے میں اس کا کیا مرتبہ ہے۔ اور طبقات فقہاء میں سے وہ کس طبقہ کا ہے۔ یہ باتیں جاننے سے مفتی کو کامل بصیرت حاصل ہوگی اور وہ مختلف رائیں رکھنے والے فقہاء کے درمیان امتیاز کر سکے گا اور متعارض اقوال میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دینے پر اس کو کافی قدرت حاصل ہوگی۔ اس لیے ذیل میں ہم فقہاء کے طبقات بیان کرتے ہیں۔..........فقہاء

---

[۱] اصول اقضیہ کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کی کتاب ہے۔

[۲] تین فقہاء کے القاب میں طلبہ کو اشتباہ ہوتا ہے۔ کمال۔ ابن الکمال اور اکمل یا الاکمل.......کمال سے علامہ ابن الہمام صاحب فتح القدیر مراد ہوتے ہیں۔ اور ابن الکمال سے علامہ ابن کمال پاشا (۱۲) اور اکمل سے علامہ اکمل الدین بابرتی صاحب عنایہ (۲) مراد ہوتے ہیں۔

کے سات طبقات (درجات) ہیں۔

پہلا طبقہ:

مجتہدین مطلق کا ہے۔ جنہوں نے شریعت میں اجتہاد کیا ہے' مثلاً ائمہ اربعہ (۱۳) اور وہ مجتہدین[1] جو ان کی روش پر چلے ہیں۔ جنہوں نے اصول فقہ کے قواعد کی بنیاد رکھی ہے اور اصول و فروع میں کسی کی تقلید کے بغیر ادلہ اربعہ........ (۱) قرآن' (۲) حدیث' (۳) اجماع اور (۴) قیاس سے فروعی احکام مستنبط کئے ہیں۔

دوسرا طبقہ:

مجتہدین فی المذہب کا ہے جیسے امام ابو یوسف (۱۴) امام محمد (۱۵) اور امام اعظم کے دوسرے تلامذہ جو اپنے استاذ کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں ادلہ اربعہ سے احکام مستنبط کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔ ان حضرات نے اگرچہ بعض جزئیات میں اپنے استاذ کی مخالفت کی ہے مگر اصول میں وہ اپنے استاذ کی پیروی کرتے ہیں۔

تیسرا طبقہ:

مجتہدین فی المسائل کا ہے۔ جن جزئیات میں امام اعظم اور ان کے تلامذہ سے کوئی روایت منقول نہیں' یہ حضرات اپنے اجتہاد سے ان کے احکام بیان کرتے ہیں۔ مثلاً خصاف (۱۶) طحاوی (۱۷) کرخی (۱۸) حلوانی (۱۹) سرخسی (۲۰) بزدوی (۲۱) اور قاضی خان (۲۲) وغیرہ۔ یہ حضرات امام اعظم کی نہ اصول میں مخالفت کر سکتے ہیں اور نہ فروع میں۔ البتہ امام اعظم کے تجویز کردہ اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر ان جزئیات کے احکام مستنبط کر سکتے ہیں جن کے بارے میں امام اعظمؒ سے کوئی قول مروی نہیں ہے۔

چوتھا طبقہ:

اصحاب تخریج کا ہے۔ یہ حضرات مقلد ہوتے ہیں۔ مثلاً جصاص رازی (۲۳) اور ان کے ہم رتبہ حضرات۔ ان حضرات میں اجتہاد کی صلاحیت مطلق نہیں ہوتی مگر چونکہ یہ حضرات اصول کو اچھی طرح محفوظ کئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان اصول کے مآخذ سے بھی

---

[1] جیسے سفیان ثوری' امام اوزاعی' اسحاق بن راہویہ' ابن ابی لیلیٰ وغیرہ۔

واقف ہوتے ہیں اس لیے صاحب مذہب سے یا ان کے کسی مجتہد شاگرد سے منقول کسی ایسے قول کی جو مجمل اور ذووجہین ہوتا ہے یا کسی ایسے حکم کی جس میں دو احتمال ہوتے ہیں' اپنی خداداد صلاحیت سے اور اپنے امام کے اصول پیش نظر رکھ کر اور نظائر و امثال پر قیاس کر کے تفصیل و تعیین کر سکتے ہیں۔ ہدایہ میں جو کہیں کہیں آتا ہے کہ کذا فی تخریج الکرخی اور کذا فی تخریج الرازی اس کا یہی مطلب ہے یعنی امام کرخی اور امام جصاص رازی نے ان مسائل کی تفصیل کی ہے۔

پانچواں طبقہ:

اصحاب ترجیح کا ہے۔ یہ حضرات بھی مقلد ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اجتہاد کی مطلق صلاحیت نہیں ہوتی۔ جیسے قدوری (۲۴) صاحب ہدایہ (۱) اور انہی جیسے دوسرے حضرات ان فقہاء کا کام مختلف روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینا ہے۔ جس کے لیے عام طور پر یہ تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں۔ (۱) ہذا اولیٰ (یہ بہتر ہے) (۲) ہذا اصح روایۃ (اس کی روایت زیادہ صحیح ہے) (۳) ہذا اوضح (یہ دلائل کے اعتبار سے زیادہ واضح ہے) (۴) ہذا اوفق للقیاس (یہ قیاس سے زیادہ ہم آہنگ ہے) ہذا ارفق للناس (اس میں لوگوں کے لیے زیادہ سہولت ہے)

چھٹا طبقہ:

اصحاب تمییز کا ہے۔ یہ حضرات بھی مقلد ہوتے ہیں۔ مگر اقویٰ' قوی اور ضعیف کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ نیز ظاہر روایت' ظاہر مذہب اور روایت نادرہ کے درمیان فرق کر سکتے ہیں مثلاً متون معتبرہ۔ کنز' مختار' وقایہ اور مجمع کے مصنفین (۲۵) ان حضرات کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مردود اقوال اور ضعیف روایتیں نقل نہ کریں۔

ساتواں طبقہ:

ان فقہاء کا ہے جو مقلد محض ہوتے ہیں اور جو مختلف اقوال میں تمیز بھی نہیں کر سکتے۔ نہ کارآمد اور نکمے کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ نہ دائیں بائیں میں فرق کر سکتے ہیں بلکہ جو کچھ مل جاتا ہے سب اپنی کتابوں میں جمع کر لیتے ہیں۔ ان کا حال رات میں لکڑیاں چننے والے جیسا ہے اور ان لوگوں کے لیے بڑی خرابی ہے جو ان کی تقلید کرتے ہیں (ابن کمال

پاشا کی عبارت پوری[1] ہوئی' درمیان سے کچھ عبارت چھوڑ بھی دی گئی ہے اور اس سلسلہ[2] میں مزید گفتگو آگے آئے گی)

فائدہ:

علامہ ابن کمال پاشا (۱۲) نے فقہاء کی جو درجہ بندی کی ہے اس کو تو علماء نے بہ نظر استحسان[3] دیکھا ہے۔ مگر ہر طبقہ کی جو مثالیں دی ہیں اس میں مناقشہ کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) صاحبین کو طبقہ ثانیہ میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات مجتہد مطلق کے درجہ کی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ (۲۶) نے شرح وقایہ کے حاشیہ عمدۃ الرعایۃ کے مقدمہ میں اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ:

''حق یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات مجتہد مطلق تھے۔ دونوں نے اجتہاد مطلق کا رتبہ حاصل کرلیا تھا مگر استاذ کی تعظیم کرتے ہوئے اور غایت ادب سے انہوں نے استاذ ہی کے اصولوں کو اپنا لیا اور انہی کی روش اختیار کی۔ اور ان کے مذہب کی نشر واشاعت اور تائید ونصرت میں لگ گئے اور اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کر دیا اس لیے ان کو مجتہد مطلق کی بجائے مجتہد فی المذہب شمار کیا گیا ہے۔''

(۲) امام خصاف امام طحاوی اور امام کرخی رحمہم اللہ کو تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے حالاں کہ ان حضرات کا درجہ اس سے بلند ہے۔ کیوں کہ انہوں نے بہت سے مسائل میں امام اعظم سے اختلاف کیا ہے جیسا کہ کتب فقہ اور کتب خلافیات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) ابوبکر جصاص رازی رحمہ اللہ کا درجہ بہت گھٹا دیا ہے۔ ان کو چوتھے درجہ میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ آپ طبقہ سوم والوں سے یعنی حلوانی اور قاضی خان وغیرہ سے زمانہ اور علم دونوں میں بڑھے ہوئے تھے۔ حضرت الاستاذ مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری

---

[1] علامہ ابن کمال پاشا کی یہ عبارت قدرے اختصار کے ساتھ علامہ شامی رحمہ اللہ نے رد المحتار ج ا۔ ص ۷۵۔ مطلب فی طبقات الفقہاء میں بھی نقل کی ہے۔

[2] یعنی ترجیح اور اصحاب ترجیح کے سلسلہ میں ۱۲

[3] علامہ کفوی نے پانچ طبقے کئے ہیں دیکھیے مقدمہ عمدۃ الرعایہ۔ انہوں نے پہلی اور آخری قسمیں چھوڑ دی ہیں اور علائی رحمہ اللہ نے درمختار میں مجتہد مطلق کے علاوہ سات طبقات کئے ہیں ۱۲۔

قدس سرہ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (۲۸) فرمایا کرتے تھے کہ جصاصؒ امام شافعی رحمہ اللہ کے درجہ کے آدمی ہیں۔

(۴) صاحب ہدایہ(۱) اور قدوری (۲۴) کا درجہ بھی گھٹا دیا ہے۔ یہ دونوں حضرات قاضی خان سے بلند رتبہ ہیں۔ ورنہ کم از کم برابر تو ضرور ہیں۔

فتویٰ دینے سے پہلے تحقیق ضروری ہے:

علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ نے فتاویٰ خیریہ (۲۸) کے آخر میں ایک فتوی کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

''مختلف فیہ مسائل میں راجح مرجوح کو پہچاننا اور قوی وضعیف کو جاننا علم فقہ کی تحصیل میں پائینچے چڑھانے والوں کی آخری آرزو ہے۔ مفتی اور قاضی کے لیے فرض ہے کہ تحقیق کے بعد جواب دیں۔ اٹکل پچو نہ ہانک دیں۔ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے سے ڈریں اور اتباع ہویٰ' خواہشات کی پیروی اور مال کی طرف میلان حرام ہے۔ یہ مال تو بڑی آفت اور مصیبت کبریٰ ہے۔ غرض فتویٰ دینا نہایت اہم کام ہے اس معاملہ میں بے باک' بد بخت و جاہل ہی ہوسکتا ہے۔'' (فتاویٰ خیریہ ج ۲ ص ۱۳۱)

ایک آدھ کتاب دیکھ کر یا غیر واضح کتابوں سے فتویٰ دینا جائز نہیں:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ مختلف فیہ اقوال میں سے راجح قول کی پیروی واجب ہے اور ترجیح دینے والوں کا حال بھی معلوم ہوگیا تو اب یہ جاننا چاہیے کہ ان فتووں کا کوئی اعتبار نہیں جو ہمارے زمانے کے اکثر مفتی صاحبان' زمانہ مابعد میں لکھی ہوئی کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کو دیکھ کر دے دیا کرتے ہیں۔ خاص طور پر غیر واضح کتابوں سے فتویٰ دینا درست نہیں ہے۔ مثلاً قہستانی کی شرح نقایہ (۲۹) علامہ حصکفی کی درمختار (۳۰) ابن نجیم مصری کی الاشباہ والنظائر (۳۱) اور اس قسم کی دوسری کتابیں۔ کیوں کہ یہ کتابیں بہت زیادہ اختصار کی وجہ سے چیستان سی بن گئی ہیں' نیز ان کتابوں میں بہت جگہ دوسری کتابوں سے عبارتیں نقل کرنے میں کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور ان کتابوں میں غیر راجح اقوال کو ترجیح بھی دی گئی ہے۔ بلکہ دیگر مذاہب کے اقوال کو بھی ترجیح دی گئی ہے۔ جن کا مذہب میں کوئی قائل نہیں ہے۔

ضعیف کتابیں:

علامہ محمد ہبۃ اللہ بعلی الاشباہ کی شرح (۳۱) کے شروع میں لکھتے ہیں کہ:

''فتویٰ کے تعلق سے ضعیف کتابیں یہ ہیں۔ کنز کی شرح ملا مسکین (۳۲) نقایہ کی شرح قہستانی (۲۹) کیوں کہ ان دونوں کتابوں کے مصنفین کا حال معلوم نہیں۔ قنیہ کے مصنف کی تمام کتابیں (۳۳) کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں ضعیف اقوال نقل کرتے ہیں، علامہ حصکفی کی درمختار (۳۰) علامہ عمر بن نجیم کی کنز کی شرح النہر الفائق (۳۴) بخاری کے شارح علامہ عینی کی کنز کی شرح رمزالحقائق (۳۵) مؤخر الذکر تینوں کتابیں مختصر ہونے کی وجہ سے مفتی بہ کتابوں میں شامل کرنے کے قابل نہیں ہیں۔''

شیخ صالح جینینی (۳۶) فرماتے ہیں کہ:

''مذکورہ کتابوں سے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ منقول عنہ کا علم ہو جائے یعنی ان کے مآخذ کا پتہ چل جائے۔''

بعلی (۳۱) کہتے ہیں کہ میں نے ان سے اسی طرح سنا ہے اور وہ علم فقہ کے مشہور علامہ تھے اور جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے اس کی ذمہ داری انہیں پر ہے (شرح اشباہ کی عبارت پوری ہوئی)

فائدہ:

علامہ شامی رحمہ اللہ نے ردالمحتار (ص۵۲۔ ج۱) میں فتویٰ کے لیے ناقابل کتابوں میں علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ کی الاشباہ والنظائر (۳۱) کو بھی شامل کیا ہے۔ کیونکہ اس کی عبارتیں بے حد مختصر ہیں اس لیے شروح یا مآخذ سے رجوع کیے بغیر ان کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے اور مولی برکلی (۳۷) نے قدوری کی شرح السراج الوہاج (۳۸) کو بھی ضعیف اور غیر معتبر کتابوں میں شمار کیا ہے؟ (کشف الظنون ج۲ص۱۶۳۱)

حوالہ کی تحقیق ضروری ہے اور حوالہ میں غلطی کی مثالیں:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ متاخرین کی کتابوں میں بیس کتابوں تک ایک بات نقل ہوتی چلی جاتی ہے حالانکہ اس مسئلہ کو پہلے بیان کرنے والے شخص سے غلطی ہوئی ہوتی ہے مگر بعد کے لوگ اس پر اعتماد کرکے نقل کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں اس کی چند

مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

پہلی مثال:

کنز الدقائق کتاب البیوع باب المتفرقات میں جہاں یہ بحث آئی ہے کہ کن چیزوں کو شرط پر معلق کرنا درست ہے اور کن چیزوں کی تعلیق درست نہیں، علامہ ابن نجیم مصری (۳۱) نے اسی قسم کی ایک غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

وَقَدْ يَقَعُ كَثِيْرًا اَنَّ مُؤلِّفًا يَذْكُرُ شَيْئًا خَطأً فِيْ كِتَابِه، فَيَاتِيْ مَنْ بَعْدَهٗ مِنَ الْمَشَايِخ، فَيَنْقُلُوْنَ تِلْكَ الْعِبَارَةَ مِنْ غَيْرِ تَغْيِيْرٍ وَّلَا تَنْبِيْهٍ، فَيَكْثُرُ النَّاقِلُوْنَ لَهَا وَاَصْلُهَا الْوَاحِد مُخْطِئٌ كَمَا وَقَعَ فِيْ هٰذَا الْمَوْضَعْ. (البحر الرائق ج۶ ص ۱۸۵)

بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصنف غلطی سے کوئی بات اپنی کتاب میں ذکر کرتا ہے پھر بعد کے علماء اس عبارت کو بعینہ نقل کرتے ہیں نہ اس کی اصلاح کرتے ہیں نہ غلطی پر تنبیہ کرتے ہیں پھر دوسرے بہت سے حضرات اس کو نقل کرتے ہیں حالانکہ پہلے لکھنے والے سے غلطی سرزد ہوئی ہوتی ہے جیسا کہ زیر بحث مسئلہ میں ایسا ہی ہوا ہے۔

دوسری مثال:

محض تلاوت قرآن کے لیے کسی کو اجرت پر لینا درست ہے یا نہیں؟ قدوری کی شرح السراج الوہاج (۳۸) اور الجوہرۃ النیرہ (۳۸) میں ہے کہ: "مفتی بہ قول یہ ہے کہ اجرت پر لینا درست ہے۔" حالانکہ وہ الٹا سمجھ گئے ہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ: "مفتی بہ قول یہ ہے کہ تعلیم قرآن کے لئے کسی کو اجرت پر لینا درست ہے، محض تلاوت پر اجارہ درست نہیں ہے۔"[1]

---

[1] سراج وہاج تو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے البتہ الجوہرہ مطبوعہ اور متداول ہے اس میں وہ بات مجھے نہیں ملی جو علامہ شامی رحمہ اللہ اُن کی طرف منسوب کر رہے ہیں بلکہ کتاب الاجارہ میں صراحت ہے کہ مفتی بہ قول تعلیم قرآن پر اجارہ کے جواز کا ہے۔ حدادی نے اس مسئلہ میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ہدایہ (۳ ص ۲۸۷) کی عبارت نقل کی ہے اور بحث کے آخری میں لکھا ہے کہ واختلفوا في الاستيجار على قراءة القرآن على القبر مدة معلومة، قال بعضهم: لايجوز، وهو المختار (جوہرہ ج ۱ ص ۲۷۲ مجتبائی) اس عبارت میں تصریح ہے کہ محض تلاوت کے بارے میں مختار قول عدم جواز کا ہے۔ ۱۲

پھر حدادی کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے حدادی کی پیروی کی اور ان کی بات نقل کرتے چلے گئے۔ حالانکہ وہ صریح غلطی تھی بلکہ بہت سے حضرات نے تو یہ کہہ دیا کہ "فتویٰ اس پر ہے کہ تمام عبادتوں پر اجارہ درست ہے۔"[1] .... یہ سب حضرات مسئلہ عموم و اطلاق کے ساتھ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ متاخرین کی رائے ہے اور بعض لوگ اس پر یہ مسئلہ بھی متفرع کرتے ہیں کہ حج کے لیے بھی اجارہ درست ہے یہ سب باتیں غلط ہیں اور پہلی غلطی سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔

فائدہ:

نقل و حوالہ پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کرنا چاہیے بلکہ حوالہ کو اصل سے ملا کر دیکھنا چاہئے۔ ہم نے حضرت الاستاذ مفتی مہدی حسن صاحب قدس سرہ (۲۷) سے ایک بار عرض کیا تھا کہ ہمیں کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "کبھی کسی کے حوالہ پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ: "اگر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ حوالہ دیں تو؟" آپ نے برجستہ فرمایا کہ: "اگر حافظ ابن حجر حوالہ دیں تب بھی!" .... میں نہیں بتا سکتا کہ حضرت الاستاذ کی اس نصیحت نے مجھے کس قدر فائدہ پہنچایا ہے۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرًا۔

طاعات پر اجارہ اور ایصال ثواب کے لیے اجرت پر قرآن خوانی کرانے کا عدم جواز:

ہمارے ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ سے بالاتفاق یہ مروی ہے کہ طاعات کا اجارہ باطل ہے۔ لیکن بعد کے مجتہدین نے جو اصحاب تخریج و تصحیح تھے۔ "ضرورت" کی وجہ سے تعلیم قرآن پر اجارہ کے جواز کا فتویٰ دیا۔ کیونکہ معلمین قرآن کو پہلے حکومت سے وظائف ملتے تھے جو بعد میں بند ہو گئے۔ اس لیے اگر تعلیم قرآن پر اجارہ اور تنخواہ لینے کو ناجائز قرار دیا جائے گا تو قرآن ضائع ہو جائے گا۔ کیونکہ اساتذۂ قرآن کو بھی کسب معاش کی فکر دامن گیر ہوگی اور قرآن کا ضیاع دین کا ضیاع ہے۔ اسی طرح بعد کے حضرات نے .... جو اصحاب ترجیح و تصحیح کے ہم رتبہ تھے۔ اذان و امامت پر بھی اجارہ کے جواز کا فتویٰ دیا کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی دینی شعائر ہیں اس لیے بر بنائے ضرورت تنخواہ لینے کو جائز قرار دیا گیا۔

---

[1] مطلقاً طاعات پر اجارہ کے جواز کا قول علامہ ابن نجیم اور علائی (۳۰) کا ہے۔ دیکھیے رسائل ابن عابدین ج ا ص ۱۶۲)

بس یہ تھا متاخرین کا فتویٰ' جو انہوں نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کی نمائندگی کرتے ہوئے دیا تھا کیونکہ آج اگر ائمہ ثلاثہ موجود ہوتے اور بدلی ہوئی صورت حال دیکھتے تو وہ بھی ضرور یہی فتویٰ دیتے اور اپنے سابق قول سے رجوع فرما لیتے۔ غرض مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ دیگر طاعات پر اجارہ کے باطل ہونے پر متون' شروح اور فتاویٰ متفق ہیں اور ان حضرات نے جواز کی بنیاد ''ضرورت'' کو یعنی دین کے ضیاع کا اندیشہ بیان کی ہے اور اس بنیاد کی انہوں نے صراحت بھی کر دی ہے۔ پھر یہ بات کیوں کر درست ہو سکتی ہے کہ متاخرین کے نزدیک محض تلاوت پر بھی اجارہ درست ہے؟ دراں حالیکہ ضرورت کا اس صورت میں تحقق نہیں ہے۔ صدیاں بھی گزر جائیں اور کوئی کسی کو محض تلاوت کے لیے اجرت پر نہ لے تو بھی کسی قسم کا ضرر نہیں ہے۔ بلکہ ضرر تو اس قسم کے اجارہ میں ہے۔ قرآن کریم کمائی کا ذریعہ اور پیشہ بن کر رہ گیا ہے' کوئی قاری لوجہ اللہ قرآن پڑھتا ہی نہیں۔ جو پڑھتا ہے اجرت کے لیے پڑھتا ہے جو خالص ریا (نمود) ہے کیونکہ ریا کی حقیقت غیر اللہ کے لیے عمل کرنا ہے۔ پس ثواب کہاں ملے گا؟ اور ایصال ثواب کس چیز کا کرے گا؟ امام قاضی خان رحمہ اللہ (۲۲) فرماتے ہیں کہ: ''ذکر کے عوض میں اجرت لینا ثواب کے استحقاق کو ختم کر دیتا ہے۔'' علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ (۳۹) نے بھی فتح القدیر ج ا ص ۲۱۶) میں مؤذن کی اجرت کی بحث میں ایسا ہی لکھا ہے۔............ اور اگر ایصال ثواب کے لیے قرآن پڑھوانے والے کو معلوم ہو جائے کہ ثواب نہیں ملے گا تو وہ دھیلا بھی نہ دے۔!

الغرض ایصال ثواب کے لیے اجرت پر قرآن پڑھوانے والے والے ذکر و قرآن کے ذریعہ جہنم کا ایندھن جمع کرتے ہیں' لوگ اس کو کار ثواب تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ عظیم ترین برائی ہے اور یہ برائی صحت اجارہ کے قول پر مرتب ہوتی ہے.......... نیز ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرانے میں اور بھی متعدد برائیاں ہیں مثلاً یتیموں کا مال کھانا' ان کے مکان میں ان کے فرش کو استعمال کرنا' چلا چلا کر سونے والوں کی نیند کو حرام کر دینا' ڈھول بجانا' گانا گانا' عورتوں اور مردوں کا اکٹھا ہونا وغیرہ خطرناک منکرات ہیں جن کی میں نے (علامہ شامی نے) اپنے ایک رسالہ میں جس کا نام شفاء العلیل' وبل الغلیل فی بطلان الوصیۃ بالختمات والتہالیل [1]

---

[1] یہ رسالہ رسائل ابن عابدین جلد اول میں صفحہ ۱۵۱ سے شروع ہوتا ہے۔

ہے' خوب وضاحت کر دی ہے اور استدلال میں فقہاءِ کے اقوال پیش کیے ہیں۔ اس رسالہ پر فقہائے معاصرین کی تقریظات ہیں جن میں سب سے بڑے خاتمۃ الفقہاء خاتمۃ العباد الناسکین' شہر قاہرہ کے مفتی' در مختار کے بہترین حاشیہ نگار استاذی مرحوم سید احمد طحطاوی رحمہ اللہ (۴۰) ہیں۔

فائدہ:

ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کا جو حکم اوپر بیان کیا گیا ہے وہی حفاظ کی اجرت یا نذرانہ ہے یعنی رمضان شریف میں تراویح میں جو حفاظ قرآن سناتے ہیں اور اس پر نذرانہ لیتے ہیں وہ درحقیقت اجرت ہے کیونکہ فقہی ضابطہ ہے کہ المعروف کالمشروط یعنی جس علاقہ میں یا جس مسجد میں دینے لینے کا رواج ہے وہاں طے کیے بغیر نذرانہ (ہدیہ) لینا بھی اجرت ہی ہے جو ناجائز ہے اور یہ حیلہ کرنا کہ ایک دو نمازیں حافظ کے ذمہ کر دی جائیں دو شرطوں کے ساتھ درست ہوسکتا ہے (۱) تنخواہ طے کی جائے ورنہ اجارہ فاسد ہوگا (۲) تراویح میں قرآن سنانا مشروط ومعروف نہ ہو' اگر تراویح میں قرآن نہ بھی سنائے تب بھی مقررہ تنخواہ ملے.........ظاہر ہے کہ مذکورہ حیلہ میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں اس لیے وہ حیلہ بھی درست نہیں.........اور یہ خیال کہ اجرت یا نذرانہ جائز نہ ہوگا تو تراویح کے نظام میں یا حفظ قرآن کے نظام میں خلل واقع ہوگا درست نہیں' تراویح تو چھوٹی سورتوں سے بھی قائم ہوسکتی ہے اور جن علاقوں میں حافظ کو کچھ نہیں دیا جاتا وہاں بھی بچے خوب قرآن یاد کرتے ہیں بلکہ یہ نذرانہ ہی حفظ قرآن کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ایسے حفاظ صرف ''رمضانی حافظ'' ہوکر رہ جاتے ہیں اور حفظ قرآن کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سامع کے لیے اجرت لینا بھی درست نہیں ہے۔ اور امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۴۹۶ سوال نمبر ۴۲۴ پر جو جواز کا فتویٰ ہے اس سے حضرت تھانوی قدس سرہ نے التذکیر حصہ سوم۔ التہذیب نمبر ۳ ص ۸۶ میں رجوع فرمالیا ہے۔ نیز فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (جدید) ج ۴ ص ۲۹۵ میں سامع کی اجرت کے عدم جواز کا فتویٰ ہے۔ (فائدہ ختم ہوا)

تیسری مثال:

سرور عالم ﷺ کی شان عالی میں گستاخی کرنے والے کی توبہ مقبول ہے یا نہیں؟ فتاویٰ

بزازیہ (برحاشیہ عالمگیری ج ۶ ص ۳۲۲) میں منقول ہے کہ ہمارے نزدیک اس کا قتل واجب ہے، توبہ مقبول نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اسلام قبول کرلے۔ صاحب بزازیہ (۴۱) نے یہ بات قاضی عیاض مالکی (۴۲) کی الشفاء اور ابن تیمیہ حنبلی (۴۳) کی الصارم المسلول کی طرف منسوب کی ہے۔[1] پھر بعد کے اکثر فقہا نے اس کی پیروی کی ہے، یہاں تک کہ خاتم المحققین علامہ ابن الہمام[2] (۳۹) اور الدرر والغرر[3] کے مصنف (۲۵) نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ حالانکہ شفاء اور صارم میں جو بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ شوافع اور حنابلہ کا مذہب ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت ہے۔ اور ہمارا مذہب قطعیت کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے۔ اور یہی بات قدماء احناف کی کتابوں میں مذکور ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ (۱۴) کی کتاب الخراج[4] امام طحاوی رحمہ اللہ (۱۷) کی مختصر کی شرح اور سغدی کی النتف الحسان (۴۴) وغیرہ فقہ حنفی کی کتابوں میں یہی بات مذکور ہے۔ میں نے (علامہ شامی نے) اس کی خوب وضاحت کردی ہے۔ اپنے ایک رسالہ میں جس کا نام ہے تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام او احد اصحابہ الکرام علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام[5] یہ رسالہ اپنے موضوع پر اتنا مفصل ہے کہ پہلے کسی نے اتنی تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔

چوتھی مثال:

مرتہن رہن کی ہلاکت کا دعویٰ کرے تو ضمان کس طرح آئے گا؟ ملاخسرو نے دررالحکام (۲۵) میں اور ابن ملک (۴۵) نے علامہ ابن الساعاتی کی مجمع البحرین (۲۵) کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ اگر مرتہن گواہوں کے بغیر ہلاکت کا دعویٰ کرے تو ضمان واجب ہوگا۔ ملاخسرو لکھتے ہیں کہ:

(وضمن) المرتهن (بدعوى الهلاک بلابينة) يعني اذا ادعى المرتهن الهلاک ضمن' ان لم يقم البينة عليه (مطلقاً) ای سواء

---

1. مگر مطبوعہ بزازیہ میں صرف الصارم کا حوالہ ہے الشفاء کا حوالہ نہیں ہے۔
2. فتح القدیر ج ۵ ص ۳۳۲ فی آخر باب احکام المرتدین۔
3. دررالحکام شرح غررالاحکام ج ۱ ص ۲۹۹ کتاب الجہاد فصل فی الجزیہ۔
4. کتاب الخراج ص ۱۸۲ فصل فی الحکم فی المرتد عن الاسلام۔
5. یہ رسالہ رسائل ابن عابدین میں ج ۱ ص ۳۱۴ سے شروع ہوتا ہے۔

كان من الاموال الظاهرة' كالحيوان والعبيد والعقار' اومن الاموال الباطنة كالنقدين والحلي والعروض وقال مالك: يضمن في الاموال الباطنة فقط(درر الحكام ۲ ص ۲۴۹)

اگر مرتہن گواہوں کے بغیر رہن کی ہلاکت کا دعویٰ کرے تو وہ ضامن ہوگا یعنی جب مرتہن رہن کی ہلاکت کا دعویٰ کرے تو وہ اس شرط کے ساتھ ضامن ہوگا کہ ہلاکت پر گواہ نہ ہوں یہ حکم مطلقاً ہے یعنی رہن خواہ ایسی چیز ہو جو چھپائی نہ جاسکتی ہو جیسے جانور' غلام اور جائداد یا چھپائی جاسکتی ہو' جیسے دراہم و دنانیر زیورات اور سامان اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صرف دوسری قسم کے اموال میں ضمان آئے گا۔

علامہ تمرتاشی (۴۵) نے بھی تنویر الابصار[۱] میں ان دونوں حضرات کی پیروی کی ہے۔ ان سب حضرات کی تحریروں کا مقتضیٰ دو باتیں ہیں۔ (۱) رہن کی جو بھی قیمت ہو۔ خواہ دین سے کم ہو یا زیادہ یا مساوی..... اس کا ضمان واجب ہوگا۔ علامہ خیر الدین رملی نے بھی یہی فتویٰ[۲] دیا ہے:

(۲) اگر رہن کی ہلاکت پر گواہ موجود ہوں تو کوئی ضمان واجب نہ ہوگا۔

حالاں کہ یہ دونوں باتیں امام مالکؒ کا مذہب[۳] ہیں اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ رہن کی قیمت اور قرض میں جو کم ہوگا اس کا ضمان واجب ہوگا' خواہ رہن کی ہلاکت پر گواہ موجود ہوں یا گواہوں کے بغیر صرف مرتہن کی قسم سے ہلاکت ثابت ہوئی ہو۔ درر الحکام کے حاشیہ شرنبلالیہ (۴۶) میں حقائق المنظومہ (۴۷) کے حوالہ سے اس کی پوری وضاحت کردی گئی ہے اور میں نے (علامہ شامی نے) بھی اپنے حاشیہ رد المحتار[۴] میں اس پر تنبیہ کی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ کس نے مذہب حنفی کے مطابق فتویٰ دیا ہے اور کس نے مخالف مذہب قول کی تردید کی ہے۔

اور بھی مثالیں:

اور اس قسم کے تسامحات کی جن کا ہم نے تذکرہ کیا بہت نظائر ہیں جن میں صاحب بحر

---

۱ تنویر علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۲۔ ۲ فتاویٰ خیریہ ج ۲ ص ۱۹۳۔

۳ امام مالک کے مذہب کے لیے دیکھیں دردیر رحمہ اللہ کی شرح صغیر مع حاشیہ صاوی ج ۲ ص ۱۲۱

۴ شامی ج ۵ ص ۳۴۲۔

(۳۱) صاحب نہر (۳۴) صاحب منح الغفار (۲۵) اور صاحب در مختار (۳۰) وغیرہم کا اتفاق ہوتا ہے حالانکہ وہ مسائل سہو ہوتے ہیں۔

سبب تسامح:

اور سبب تسامح نقل عبارت میں غلطی یا سبقت نظر ہوتی ہے یعنی عبارت نقل کرتے وقت نظر ہٹ جاتی ہے اور درمیان سے کچھ عبارت چھوٹ جاتی ہے، جس کی وجہ سے مفہوم غلط ہو جاتا ہے۔

حاشیہ شامی کی خوبی:

میں نے (علامہ شامی نے) اپنے حاشیہ ردالمحتار میں اس قسم کے تسامحات پر تنبیہ کی ہے۔ کیونکہ میں نے اس حاشیہ کی تصنیف کے وقت متقدمین کی ان کتابوں کی مراجعت کا التزام کیا ہے جن کی طرف یہ حضرات مسائل منسوب کرتے ہیں۔ میں ایسی جگہوں میں اصل عبارت ذکر کرتا ہوں، جس کو نقل کرنے میں سہو واقع ہوا ہے، پھر اس کے ساتھ مزید حوالے بڑھاتا ہوں جن سے اصل عبارت کی تائید ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ حاشیہ بے نظیر ہے۔ اس کی تحصیل سے کوئی شخص بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل میں میری مدد فرمائیں۔

متاخرین کی کتابوں میں بھی تسامحات ہیں:

الغرض کم واقفیت رکھنے والا شخص جب کسی مسئلہ کو ایک یا زیادہ کتابوں میں دیکھ لیتا ہے تو وہ گمان کرتا ہے کہ یہی مذہب ہے اور وہ اسی پر فتویٰ دے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ متاخرین کی کتابیں ہیں، جو متقدمین کی کتابوں سے بخوبی واقف تھے انہوں نے اپنی کتابوں میں معمول بہا مسائل ہی لکھے ہوں گے، حالانکہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ اکثری قاعدہ ہے۔ متاخرین سے اس کے خلاف بھی باتیں وقوع پذیر ہوئی ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

میں نے (علامہ شامی نے) ایک بار وقف کے ایک مسئلہ میں[1] عام کتابوں کے مطابق فتویٰ دیا اس مسئلہ میں عمدۃ المتاخرین علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ (۳۰) پر معاملہ مشتبہ ہو گیا

---

[1] یہ وقف علی الاولاد کا ایک مخصوص مسئلہ ہے جس کی تشریح یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتی شائقین درمختار علیٰ ہامش الشامی ج ۳ ص ۴۷۷ قوله' مالو وقف علی ذرية مرتباً وجعل من شرط الخ مع حاشیہ شامی دیکھیں اور علامہ شامی نے اپنے جس فتویٰ کا یہاں تذکرہ کیا ہے اس کے لیے ان کا رسالہ اجوبہ محققہ عن اسئلہ متفرقہ دیکھیں جو رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۱۲۶ سے شروع ہوا ہے۔۱۲

ہے۔ انہوں نے درمختار میں اس مسئلہ کو خلاف صواب ذکر فرمایا ہے۔ میرا وہ فتویٰ ملک کے بعض مفتیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اس کی پشت پر میرے فتویٰ کے خلاف اور درمختار کے مطابق فتویٰ لکھا اور بعض نے تو یہ بھی لکھا کہ:

''علائی (درمختار) میں جس طرح مسئلہ ہے وہی معمول بہا ہے' کیوں کہ وہ متاخرین میں معتمد علیہ ہیں۔''

نیز یہ بھی لکھا کہ:

''اور اگر تمہارے پاس اس کے خلاف دلیل ہے تو اس کو قبول نہیں کریں گے۔''

دیکھا آپ نے جہل عظیم! اور احکام شرعیہ میں تہور و دلیری! اور کتابوں کی طرف مراجعت کیے بغیر اور علم کے بغیر فتویٰ نویسی پر اقدام! کاش ان صاحبوں نے علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ (۴۸) کا درمختار کا حاشیہ ہی دیکھ لیا ہوتا کیونکہ وہ ان کو بآسانی دستیاب ہوسکتا تھا۔ حلبی نے اس موقعہ پر تنبیہ کی ہے کہ علائی نے جو کچھ لکھا ہے وہ مسئلہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔

محض مطالعہ سے فتویٰ دینا جائز نہیں:

علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ (۵) کے فتاویٰ میں میری نظر سے گزرا ہے کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے' اس نے کسی استاذ سے علم فقہ حاصل نہیں کیا اور اپنے مطالعہ کے زور پر فتویٰ دیتا ہے تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اس شخص کے لیے فتویٰ دینا کسی بھی طرح درست نہیں' کیوں کہ وہ عامی جاہل ہے' اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے...... بلکہ جو شخص معتبر اساتذہ سے علم فقہ حاصل کرتا ہے اس کے لیے بھی ایک دو کتابیں دیکھ کر فتویٰ دینا جائز نہیں اور امام نووی رحمہ اللہ (۴۹) تو یہ فرماتے ہیں کہ دس بیس کتابیں دیکھ کر بھی فتوی دینا جائز نہیں کیونکہ اتنے آدمی بھی کبھی ایسے قول پر اعتماد کر لیتے ہیں جو مذہب میں ضعیف ہوتا ہے اور ضعیف قول میں تقلید جائز نہیں۔

فتویٰ دینے کے لیے کیا صلاحیتیں ضروری ہیں؟

ہاں جو شخص فقہ کا ماہر ہے۔ جس نے معتبر اساتذہ سے علم فقہ حاصل کیا ہے اور اس میں فقہ کا فطری ذوق بھی ہے اور اس کو فقہ کا ملکہ حاصل ہو گیا ہے تو ایسا شخص صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اور مسائل اور ان کے متعلقات کو قابل اعتماد طریقہ پر جان سکتا ہے۔ غرض ایسا شخص

لوگوں کو فتویٰ دے سکتا ہے' یہ شخص اس قابل ہے کہ لوگوں کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ بنے۔

نا اہل مفتی کی سزا:

اور جو شخص ایسا نہیں ہے اگر وہ اس منصب شریف پر چڑھنے کی کوشش کرے تو اس کو ایسی عبرتناک سزا دینی چاہیے' اور اس کو ایسی سخت سرزنش کرنی چاہیے کہ وہ سزا دوسروں کو ایسی حرکت کرنے سے باز رکھے۔ کیونکہ ایسے شخص کے مفتی بننے میں بے شمار مفاسد ہیں واللہ اعلم (ابن حجر کا فتویٰ پورا ہوا)

فتویٰ ظاہر روایت پر دینا چاہئے:

دسویں شعر میں کہا گیا تھا کہ ظاہر روایت کی پیروی واجب ہے بشرطیکہ ارباب ترجیح نے اس کے خلاف دوسرے قول کو ترجیح نہ دی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسائل امام محمد رحمہ اللہ (۱۵) کی مشہور کتابوں میں مروی ہیں ان پر فتویٰ دینا چاہیے۔ اگرچہ کسی امام نے صراحۃً ان کی تصحیح نہ کی ہو' کیونکہ ان کا ظاہر روایت ہونا ہی ان کی صحت کی بڑی دلیل ہے۔...... ہاں اگر ائمہ کسی ایسی روایت کی تصحیح کریں جو کتب ظاہر روایت کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے تو پھر ان کی تصحیح کی پیروی کی جائے گی۔ علامہ طرسوی رحمہ اللہ (۵۰) انفع الوسائل میں یک مابہ کفالہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مقلد قاضی کے لیے ظاہر روایت کے مطابق ہی فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ شاذ روایت پر قاضی فیصلہ نہیں کر سکتا الا یہ کہ ائمہ نے صراحت کی ہو کہ فتویٰ شاذ روایت پر ہے اھ۔''

۱۱۔ وَكُتُبُ ظَاهِرِ الرِّوَايَاتِ أَتَتْ سِتًّا وَبِالْأُصُوْلِ أَيْضاً سُمِّيَتْ

ترجمہ: اور ظاہر روایت کی کتابیں آئی ہیں (تعداد میں) چھ' اور وہ ''اصول'' بھی کہلاتی ہیں۔

تشریح: دوسرا مصرع شامی ج ۱ ص ۳۸ میں اس طرح ہے سِتًّا' لِكُلِّ ثَابِتٍ عَنْهُمْ حَوَتْ یعنی انکی تعداد چھ ہے اور وہ ہمارے ائمہ ثلاثہ کی تمام ثابت روایات کا احاطہ کر لیتی ہیں۔

ظاہر الروایۃ کی ترکیب:

ظاہر الروایہ مرکب اضافی ہے مگر حقیقت میں مرکب توصیفی ہے ای روایۃٌ ظاہرۃٌ یعنی ایسی

روایت جس سے ہر کوئی واقف ہے کیوں کہ وہ تواتر یا شہرت کے ساتھ مروی ہے کسی سے مخفی نہیں ہے۔ کلام کو سبک کرنے کے لیے ترتیب پلٹ کر مرکب اضافی بنایا گیا ہے مگر معنی مرکب توصیفی کے برقرار ہیں۔ جیسے جمیل الجسم کا مفہوم بھی وہی ہے جو جسم جمیل کا ہے۔

اصول کے معنی:

اور اصول اصل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں جڑ بنیاد۔ چونکہ امام محمد علیہ الرحمہ کی یہ چھ کتابیں فقہ حنفی کی بنیاد ہیں اس لیے ان کو ''اصول'' اور ''اصول ستہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

۱۲۔ صَنَّفَهَا مُحَمَّدُنِ الشَّيْبَانِيُّ حَرَّرَ فِيْهَا الْمَذْهَبَ النُّعْمَانِيُّ

ترجمہ: امام محمد بن الحسن شیبانی رحمہ اللہ (۵) نے ان کو تصنیف کیا ہے۔ آپ نے ان کتابوں میں امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب کو عمدہ طور پر بیان کیا ہے۔ حَرَّرَ الْكِتَابَ: حشو و زوائد سے پاک کرنا۔

۱۳۔ اَلْجَامِعُ الصَّغِيْرُ وَالْكَبِيْرُ وَالسِّيَرُ الْكَبِيْرُ وَالصَّغِيْرُ

ترجمہ: جامع صغیر اور جامع کبیر۔ سیر کبیر اور سیر صغیر۔

تشریح: یہ چاروں ظاہر روایت کی کتابیں ہیں۔ ان کا تعارف درج ذیل ہے۔

جامع صغیر کا تعارف:

جامع صغیر امام محمد رحمہ اللہ (۱۵) کی مشہور متبرک کتاب ہے۔ بار ہا طبع ہو چکی ہے۔ صاحب ہدایہ (۱) نے بدایۃ المبتدی میں جامع صغیر اور قدوری کے مسائل کو جمع کیا ہے۔ اس کا مکمل تعارف اور وجہ تصنیف آگے آ رہی ہے۔ امام طحاوی، جصاص رازی بزدوی، ابو اللیث سمرقندی (۵۱) سرخسی، قاضی خان اور بہت سے حضرات نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ مولانا فرنگی محلی (۲۶) کا بھی اس پر قیمتی حاشیہ ہے اور النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر کے نام سے مبسوط مقدمہ ہے۔

جامع کبیر کا تعارف:

جامع کبیر امام محمد رحمہ اللہ کی اہم ترین اور دقیق ترین کتاب ہے۔ امام محمد بن شجاع ثلجی بغدادی (و ۱۸۱ھ ف ۲۶۶ھ) جو ایک واسطہ سے امام اعظم کے تلمیذ ہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''اسلامی لٹریچر میں، علم فقہ میں، جامع کبیر جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔'' بابرتی (۲) فرماتے ہیں

کہ ''جامع کبیر علم فقہ کے اہم مسائل کا بڑا مجموعہ ہے۔ اس میں ایسی چیدہ روایات اور ایسے مضبوط دلائل ہیں کہ اس کو ایک معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔''

یہ کتاب انتہائی دقیق ہے چنانچہ تمام اکابر احناف نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام طحاوی' کرخی ابو خازم (۵۲) جصاص رازی' فقیہ ابو اللیث سمرقندی' جرجانی (۵۳) حلوائی' سرخسی' بزدوی برادران (۲۱) قاضی خان' صاحب ہدایہ اور جمال الدین حصیری (۵۴) وغیرہم رحمہم اللہ نے اس کتاب کی خدمت کی ہے۔ مگر اب تک کوئی شرح طبع نہیں ہوئی۔ اصل کتاب مولانا ابو الوفا افغانی حیدر آبادی رحمہ اللہ نے تین قلمی نسخوں کی مدد سے تصحیح کر کے حیدر آباد سے شائع کی ہے جو متوسط سائز کے پونے چار سو صفحات میں ہے۔ پاکستان سے اس کا فوٹو شائع ہوا ہے۔

جامع کبیر کے دو نسخے ہیں۔ جب امام محمد رحمہ اللہ نے اس کو شروع میں تصنیف کیا تھا تو ان کے تلامذہ ابو حفص کبیر (۵۵) ابو سلیمان جوزجانی (۵۶) ہشام رازی (۵۷) اور ابن سماعہ (۵۸) وغیرہم نے اس کو روایت کیا تھا یہ پہلا نسخہ ہے۔ پھر مصنف نے اس پر نظر ثانی کی اور اس میں بہت سے ابواب و مسائل کا اضافہ کیا اس نسخہ کو بعد کے تلامذہ نے روایت کیا یہ دوسرا نسخہ کہلاتا ہے۔

صغیر و کبیر میں فرق:

امام محمد رحمہ اللہ کی جن کتابوں کے نام میں لفظ ''صغیر'' ہے وہ بہت آسان ہیں مثلاً جامع صغیر اور سیر صغیر اول مطبوعہ ہے ہر کوئی پڑھ کر اندازہ کر سکتا ہے اور سیر صغیر اگرچہ مطبوعہ نہیں ہے مگر اس کو پڑھنے کے بعد امام اوزاعی رحمہ اللہ (۵۹) نے جو تبصرہ کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب اتنی آسان تھی کہ ان کی نظر میں جچی ہی نہیں۔ فرمایا کہ **مالا هل العراق و التصنیف فی هذا الباب؟ فانه لاعلم لهم بالسیر** (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۱۴)

اور جن کتابوں کے نام میں لفظ ''کبیر'' ہے وہ اس قدر دقیق ہیں کہ جلیل القدر ائمہ بھی مشکل ہی سے حل کر پاتے ہیں۔ جامع کبیر مطبوعہ موجود ہے جس کا جی چاہے پڑھ کر اندازہ کرے۔ اور سیر کبیر کی اصل موجود نہیں' امام سرخسی رحمہ اللہ کی شرح میں بھی اس کا مکمل متن نہیں ہے۔ مگر اس کا مطالعہ کرنے کے بعد امام اوزاعیؒ نے جو تبصرہ کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کا لوہا مان لیا تھا۔ فرمایا کہ **لو لا ماضمنه من الاحادیث لقلت انه یضع**

العلم من نفسہ (کشف الظنون)

سیر صغیر وکبیر کا تعارف:

سیر' سیرۃ کی جمع ہے جس کے معروف معنی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری اور غیر معروف معنی ہیں: ''آنحضرت ﷺ کی جنگوں کے احوال'' جس کے لیے مابعد زمانہ میں لفظ ''مغازی'' مستعمل ہوا ہے یا اس کے معنی ہیں: ''اسلام کا جنگی نظام'' یہی آخری ترجمہ امام محمد رحمہ اللہ کی کتابوں پر چسپاں ہے۔ آپ نے اسلام کے جنگی نظام پر دو کتابیں لکھی ہیں جن کا مکمل تعارف آگے آ رہا ہے۔ ایک سیر صغیر جو اب تک طبع نہیں ہوئی نہ اس کے مخطوطہ کا علم ہے۔ دوسری سیر کبیر' یہ بھی طبع نہیں ہوئی نہ اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ البتہ امام سرخسی رحمہ اللہ (۲۰) کی شرح چار جلدوں میں طبع ہوگئی ہے مگر اس میں اصل کتاب کا مکمل متن موجود نہیں ہے۔ کیونکہ سرخسی رحمہ اللہ نے یہ شرح جیل خانہ میں کتابوں کی مراجعت کے بغیر لکھوائی تھی۔

۱۴۔ ثُمَّ الزِّيَادَاتُ مَعَ الْمَبْسُوطُ   تَوَاتَرَتْ بِالسَّنَدِ الْمَضْبُوطُ

ترجمہ: پھر زیادات' مبسوط کے ساتھ۔ مضبوط سند کے ساتھ بہ طریق تواتر مروی ہیں۔

زیادات اور زیادات الزیادات کا تعارف:

امام محمد رحمہ اللہ نے جامع کبیر پر نظر ثانی کر کے اس میں قیمتی اضافے کیے تھے جو جامع کبیر کا دوسرا نسخہ کہلاتا ہے پھر کچھ اور مسائل سامنے آئے تو ان کے لیے ایک مستقل کتاب لکھی۔ جو زیادات کہلائی یعنی جامع کبیر میں اضافہ یا اس کا ضمیمہ پھر کچھ اور جزئیات سامنے آئیں تو زیادات الزیادات لکھی یعنی ضمیمہ در ضمیمہ۔ یہ مختصر کتاب ہے اس میں صرف سات باب ہیں۔ ان دونوں ضمیموں کو ایک ہی شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ یہ دونوں ضمیمے ابھی تک طبع نہیں ہوئے نہ ان کے قلمی نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ البتہ زیادات الزیادات کی دو شرحیں ایک سرخسی رحمہ اللہ کی اور دوسری علامہ ابونصر عتابی (۵۴) کی علامہ ابوالوفا افغانی رحمہ اللہ کی تصحیح کے ساتھ حیدرآباد سے طبع ہو چکی ہیں۔

کتاب الاصل (مبسوط) کا تعارف:

کتاب الاصل امام محمد رحمہ اللہ کی اہم ترین اور سب سے بڑی تصنیف ہے۔ بلکہ فقہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے امام محمد رحمہ اللہ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام محمدؒ نے اس کتاب کے تمام ابواب الگ الگ تصنیف کیے تھے اور ان کے مستقل نام رکھے تھے مثلاً کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ' کتاب البیوع وغیرہ' پھر سب کو یکجا کر کے کتاب الاصل نام رکھا لوگ اسی کو امام محمد کی مبسوط بھی کہتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں جو آتا ہے کہ قال محمد فی کتاب البیوع یا قال محمد فی کتاب الصلوٰۃ تو اس سے مراد مبسوط کے یہی ابواب ہیں۔

اسی مبسوط کے بارے میں قصہ مشہور ہے کہ ایک عیسائی دانشمند اس کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہو گیا اور اس نے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا کہ 'ہذا کتاب محمد کم الاصغر' فکیف کتاب محمد کم الاکبر؟ (مقدمہ مبسوط ج ا ص ۴) امام شافعی رحمہ اللہ نے اس مبسوط کو حفظ کیا تھا اور کتاب الام میں اس کی نقل کی ہے۔ امام محمدؒ اس کتاب میں اپنی اور اپنے دونوں اساتذہ کی رائیں ذکر کرتے ہیں اور عام طور پر دلائل بیان نہیں کرتے مگر جن مسائل کے دلائل غامض ہوتے ہیں ان کے عقلی اور نقلی دلائل بھی لکھتے ہیں۔ کتاب کا انداز بیان شگفتہ عبارت سلیس اور آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا ابو الوفا افغانی رحمہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں' انہوں نے پانچ مخطوطوں کی مدد سے کتاب کی تصحیح کر کے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے۔ جلد چہارم کی ضخامت زیادہ ہو گئی تھی اس لیے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح کل پانچ جلدیں ہو گئی ہیں۔

۱۵۔ کَذَالَهٗ مَسَائِلُ النَّوادِرُ اَسْنَادُهَا فِیْ الْکُتُبِ غَیْرُ ظَاهِرُ

ترجمہ: اسی طرح امام محمد رحمہ اللہ کی تصانیف میں ''مسائل النوادر'' بھی ہیں۔ جن کی سندیں کتابوں میں ظاہر (مشہور) نہیں ہیں۔

کتب نوادر کا تعارف:

مذکورہ بالا کتب ستہ' کتاب ظاہر روایت کہلاتی ہیں۔ کیونکہ ان کو امام محمدؒ سے بہت سے تلامذہ روایت کرتے ہیں' ان کے مسائل درجہ شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں۔ امام محمد رحمہ اللہ کی ان کے علاوہ اور بھی متعدد فقہی تصنیفات ہیں مگر ان کو کوئی ایک ہی شاگرد روایت کرتا ہے اس لیے ان کے مسائل مشہور نہیں ہیں۔ ان کتابوں کو کتب نوادر (غیر مشہور) اور ان کے مسائل کو مسائل النوادر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح امام محمدؒ کے علاوہ امام اعظم رحمہ اللہ کے دوسرے تلامذہ کی فقہی

تصنیفات بھی کتب نوادر کہلاتی ہیں۔نوادر کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

۱۶۔ وَبَعْدَهَا مَسَائِلُ النَّوَازِلُ خَرَّجَهَا الْاَشْيَاخُ بِالدَّلَائِلُ

ترجمہ:اور''نوادر'' کے بعد''مسائل النوازل'' کا درجہ ہے۔جن کی مشائخ نے دلائل سے تخریج کی ہے۔

کتب نوازل کا تعارف:

نوازل' نازلۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پیش آمدہ واقعہ اور اصطلاح میں نازلہ' وہ نیا مسئلہ ہے جو مجتہدین کا زمانہ گزر جانے کے بعد پیش آیا ہے اور اس کا حکم مجتہدین سے مروی نہیں ہے۔بعد کے اکابر نے دلائل سے اس کا حکم بیان کیا ہے فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ(۵۱) کی کتاب النوازل غالباً اسی قسم کے مسائل کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کا تعارف آگے آرہا ہے۔

اصحاب اور مشائخ میں فرق:

اصحاب' صاحب کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں ساتھی۔اور عرفی معنی ہیں استاذ اور شاگرد اور شیخ سے مراد وہ عالم دین ہوتا ہے جو لوگوں کے نزدیک علم' فضیلت اور مرتبہ کے لحاظ سے بڑا ہو اس کی جمع اشیاخ وشیوخ اور مشیخۃ آتی ہے اور جمع الجمع مشائخ ہے۔

اور اصطلاح میں اصحاب سے ائمہ ثلاثہ(امام اعظم اور صاحبین) مراد ہوتے ہیں اور کبھی امام صاحب اور ان کے تمام بلا واسطہ تلانذہ مراد ہوتے ہیں اور مشائخ سے وہ فقہائے متقدمین مراد ہوتے ہیں جنہوں نے امام اعظم کا زمانہ نہیں پایا ہے المشہور: اطلاق''اصحابنا'' علی ائمتنا الثلاثۃ:ابی حنیفۃ وصاحبیہ کما ذکرہ فی شرح الوہبانیۃ' واما المشائخ 'ففی وقف النہر عن العلامۃ قاسم: ان المراد بہم فی الاصطلاح من لم یدرک الامام اھ(ردالمحتار ج۳ص۴۹۷)

متقدمین اور متاخرین کی تحدید:

علامہ ذہبی رحمہ اللہ(۷۶) نے تیسری صدی کے ختم کو متقدمین اور متاخرین کے درمیان حد فاصل قرار دیا ہے۔شامی رحمہ اللہ شفاء العلیل میں لکھتے ہیں فائدۃ: **قال الذهبي: الحد الفاصل بين العلماء المتقدمين والمتاخرين رأس القرن الثالث' وهو الثلاثمائة اه فالمتقدمون من قبله والمتاخرون من بعده** (رسائل ابن عابدین ج۱ص۱۶۱) یعنی تیسری صدی کے ختم تک جو علماء گزرے ہیں وہ متقدمین کہلاتے ہیں اور اس کے بعد والے متاخرین۔

دوسرا قول یہ ہے کہ متقدمین وہ ہیں جنہوں نے امام اعظم اور صاحبین کا زمانہ پایا ہے اوران سے استفادہ کیا ہے اور جنہوں نے ائمہ ثلاثہ کا زمانہ نہیں پایا وہ متاخرین ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ امام محمدؒ تک متقدمین ہیں اور ان کے بعد حافظ الدین بخاری رحمہ اللہ (۷۷) تک علمائے متاخرین ہیں (مبادیات فقہ ص۷۳)

سلف اور خلف سے مراد:

اصطلاح میں امام اعظم سے امام محمد تک سلف اور امام محمد کے بعد شمس الائمہ حلوائی (۱۹) تک خلف کہلاتے ہیں (مبادیات فقہ ص۷۴) اب شرح عقود رسم المفتی کا ترجمہ شروع ہوتا ہے اب تک اشعار کے ضمن میں جو تشریحات اور فوائد آئے ہیں وہ اضافہ تھے۔

طبقات المسائل:

یہ بات جان لینی چاہیے کہ ہمارے ائمہ کے بیان کردہ مسائل کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ:

مسائل الاصول کا ہے جن کو ظاہر روایت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو ائمہ مذہب یعنی امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ سے مروی ہیں۔ ان تین حضرات کو ''ائمہ ثلاثہ'' کہا جاتا ہے۔ اور گاہے ان کے ساتھ امام زفر (۷۸) اور امام حسن بن زیاد (۷۹) وغیرہ کو بھی ملا لیا جاتا ہے جنہوں نے امام اعظم سے پڑھا ہے۔ مگر عام طور پر ظاہر روایت کی اصطلاح ائمہ ثلاثہ کے اقوال کے لیے یا ان میں سے بعض کے اقوال کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

اور ظاہر روایت کے مسائل اور اصول کے مسائل وہ ہیں جو امام محمد رحمہ اللہ کی چھ کتابوں میں مذکور ہیں یعنی (۱) مبسوط' (۲) زیادات' (۳) جامع صغیر' (۴) سیر صغیر' (۵) جامع کبیر اور (۶) سیر کبیر میں۔ اور ان کو ظاہر روایت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ امام محمد رحمہ اللہ سے قابل اعتماد راویوں کے ذریعہ منقول ہیں یعنی یہ مسائل امام محمد رحمہ اللہ سے تواتر یا شہرت کے ساتھ منقول ہیں۔

دوسرا درجہ:

مسائل النوادر کا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو مذکورہ بالا ائمہ مذہب ہی سے مروی ہیں مگر وہ مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور نہیں ہیں بلکہ:

(۱) یا تو امام محمد رحمہ اللہ کی ان چھ کتابوں کے علاوہ دوسری فقہی کتابوں میں مذکور ہیں'

جیسے کیسانیات' ہارونیات' جرجانیات اور رقیات میں[1] اور ان مسائل کو غیر ظاہر الروایہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مسائل مذکورہ بالا کتابوں کے مسائل کی طرح امام محمدؒ سے صحیح' ثابت اور مشہور روایت سے مروی نہیں ہیں۔

(۲) یا وہ مسائل امام محمد رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر تلامذۂ امام اعظم کی کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً امام حسن بن زیادہ (۷۹) کی کتاب المجرد میں اور اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں...... امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی امالی میں جو مسائل مذکور ہیں وہ بھی اسی قسم میں شامل ہیں۔

فائدہ:

امالی جمع ہے املاء کی جس کے معنی ہیں لکھانا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی عالم بیٹھ جاتا اور اس کے گرد اس کے تلامذہ قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتے۔ اللہ تعالیٰ اس عالم کے دل میں جو کچھ ڈالتا وہ زبانی لکھواتا۔ پھر وہ کاپیاں جمع کر لی جاتیں تو ایک مستقل کتاب بن جاتی۔ یہ طریقہ املاء یا امالی کہلاتا تھا۔ سلف میں محدثین' فقہاء اور ادباء وغیرہ سب ہی یہ طریقہ اختیار کرتے تھے اور اپنی اپنی لائن کے علوم لکھواتے تھے۔ اب نہ وہ علماء رہے اور نہ وہ علم ہی رہا' اس لیے املاء کا یہ طریقہ بس قصہ پارینہ بن کر رہ گیا۔ شوافع کی اصطلاح میں اس کو تعلیقہ کہا جاتا ہے۔

(۳) یا ان مسائل کو امام محمد رحمہ اللہ کا کوئی ایک ہی شاگرد روایت کرتا ہے جیسے ابن سماعہ (۵۸) اور معلٰی بن منصور (۸۰) وغیرہ کے روایت کردہ مخصوص مسائل۔

تیسرا درجہ:

فتاویٰ اور واقعات[2] کا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو بعد کے مجتہدین نے اس وقت مستنبط

---

[1] کیسانیات وہ مسائل ہیں جو شعیب بن سلیمان کیسانی رحمہ اللہ نے امام محمد رحمہ اللہ سے روایت کیے ہیں۔ ان کو امالی بھی کہا جاتا ہے اس کا ایک حصہ حیدر آباد سے طبع ہو چکا ہے (مقدمہ زیادات ص ۹) ہارونیات وہ مسائل ہیں جو ہارون رشید کے لیے یا اس سے تعلق کے زمانہ میں بیان کیے ہیں۔ جرجانیات وہ مسائل ہیں جو علی بن صالح جرجانی نے امام محمدؒ سے روایت کیے ہیں (مقدمہ زیادات وکشف الظنون) رقیات وہ مسائل ہیں جو ابن سماعہ نے امام محمدؒ سے روایت کیے ہیں امام محمد رحمہ اللہ نے ان مسائل کو رقہ شہر کے قیام کے زمانہ میں مستنبط کیا ہے (مقدمہ زیادات وکشف ج ا ص ۹۱۱)

[2] فتاویٰ اور واقعات ایک ہی مفہوم کے لیے دو لفظ ہیں۔ ۱۲

کیا ہے جب ان سے وہ مسائل دریافت کیے گئے اور ان کے بارے میں متقدمین اہل مذہب کی کوئی روایت ان کو نہیں ملی۔

بعد کے یہ مجتہدین صاحبینؒ کے تلامذہ' پھر ان کے تلامذہ' سلسلہ بہ سلسلہ ہیں۔ جن کی تعداد بہت ہے ان کے احوال جاننے کے لئے فقہائے احناف کی طبقات کی کتابوں (۶۰) کی طرف اور عام تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مثلاً صاحبین کے تلامذہ کی ہیں عصام بن یوسف (۱۱۰) ابن رستم (۶۲) محمد بن سماعہ (۵۸) ابوسلیمان جوز جانی (۵۶) اور ابو حفص بخاری (۵۵) اور جو حضرات ان کے بعد ہیں وہ یہ ہیں محمد بن سلمہ (۶۳) محمد بن مقاتل (۶۴) نصیر بن یحییٰ (۶۵) اور ابو نصر محمد بن سلام (۶۶) رحمہم اللہ۔

فائدہ:

کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ متاخرین مجتہدین کے سامنے ایسے دلائل آتے ہیں اور ایسے اسباب ظاہر ہوتے ہیں کہ وہ اصحاب مذہب کی مخالفت کرتے ہیں [۱] اور ہماری معلومات میں سب سے پہلی وہ کتاب جس میں ان مشائخ کے فتاویٰ جمع کیے گئے ہیں۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ (۵۱) کی کتاب النوازل ہے پھر مشائخ نے اور کتابیں جمع کی ہیں جیسے ناطفی (۶۷) کی مجموع النوازل والواقعات اور صدر شہید (۶۸) کی واقعات حسامیہ۔

پھر متاخرین نے ان سب کو (مسائل الاصول' مسائل النوادر اور مسائل النوازل کو) اس طرح رلا ملا کر لکھا ہے کہ ان میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ جیسا کہ فتاویٰ قاضی خان (۲۲) اور خلاصۃ الفتاویٰ (۶۹) وغیرہ میں کیا گیا ہے اور بعض حضرات نے تینوں قسم کے مسائل میں امتیاز باقی رکھا ہے۔ مثلاً رضی الدین سرخسی (۷۰) کی کتاب المحیط میں پہلے مسائل الاصول کو پھر نوادر کو پھر فتاویٰ کو ذکر کیا ہے۔ ان کا طریقہ بہت ہی عمدہ ہے۔

مبسوط کے نسخے اور شروح:

اور یہ بھی جان لیں کہ امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط کے نسخے (روایتیں) متعدد ہیں۔ ان میں سے مشہور نسخہ ابو سلیمان جوز جانی (۵۶) کا ہے۔ مبسوط کی بہت سے متاخرین نے شرحیں لکھی ہیں مثلاً شیخ الاسلام بکر نے جو خواہر زادہ (۷۱) سے معروف ہیں۔ آپ کی شرح ''بڑی مبسوط''

---

[۱] جیسے تعلیم قرآن اور امامت واذان پر اجرت کے جواز کا مسئلہ۔۱۲

کہلاتی ہے اور شمس الائمہ حلوانی (۱۹) نے اور ان کے علاوہ دیگر حضرات نے ان سب کی مبسوطیں درحقیقت امام محمدؒ کی مبسوط کی شرحیں ہیں۔ ان شارحین نے شرح کی عبارت امام محمدؒ کی مبسوط کی عبارت کے ساتھ ملا کر لکھی ہے۔ یہی طریقہ جامع صغیر کے شارحین نے اختیار کیا ہے۔ مثلاً فخر الاسلام بزدوی (۲۱) اور قاضی خان (۲۲) وغیرہ نے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ''قاضی خان نے یہ بات جامع صغیر میں ذکر کی ہے'' اور ان کی مراد جامع صغیر کی شرح ہوتی ہے۔ (طبقات المسائل والے عنوان سے یہاں تک کا مضمون علامہ شامی رحمہ اللہ نے دو کتابوں سے اخذ کیا ہے ایک علامہ بیری کی شرح اشباہ (۴۱) سے دوسری شیخ اسماعیل نابلسی رحمہ اللہ کی شرح درر (۴۷) سے)۔

روایت الاصول اور ظاہر الروایہ میں کوئی فرق نہیں

(علامہ ابن کمال پاشا پر رد)

مذکورہ بالا باتوں کے بعد اب جاننا چاہیے کہ علامہ ابن کمال پاشا (۱۲) نے روایت الاصول اور ظاہر الروایہ میں فرق کیا ہے۔ ہدایہ کی شرح میں عورت پر وجوب حج کے مسئلہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''سرخسی رحمہ اللہ (۳۰) کی مبسوط میں ہے کہ: ''ظاہر الروایہ یہ ہے کہ عورت پر حج کی ادائیگی اس وقت فرض ہوتی ہے جب اس کے پاس اپنے نفقہ کے علاوہ اپنے محرم کا نفقہ بھی ہو'' اور محیط اور ذخیرہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

> ''حسن بن زیاد کی روایت امام ابوحنیفہؒ سے یہ ہے کہ عورت کے پاس جب اپنا اور اپنے محرم کا نفقہ ہو تو اس پر حج کرنا فرض ہوتا ہے اور امام محمدؒ سے روایتیں مختلف ہیں۔''

پھر آگے ابن کمال پاشا لکھتے ہیں کہ:

> ''یہاں سے ظاہر ہوا کہ سرخسیؒ کی مراد ظاہر الروایہ سے حسنؒ کی امام ابوحنیفہ سے روایت ہے پس ظاہر الروایہ اور روائیت الاصول کے درمیان فرق واضح ہو گیا۔ کیونکہ ''اصول'' سے مراد مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات اور سیر کبیر ہیں اور

ان کتابوں میں حسن کی روایت نہیں ہے۔ یہ سب کتابیں امام محمد کی روایتیں ہیں۔
نیز یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ نوادر کی روایت بھی کبھی ظاہر الروایہ ہوسکتی ہے اور
نوادر کی روایت سے مراد اصول کے علاوہ باقی کتابوں کی روایتیں ہیں۔''

پھر آخر میں ابن کمال پاشا تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس بات کو یاد رکھیں۔ کیونکہ یہ پہلو ہدایہ کے شارحین سے مخفی رہ گیا ہے اور ہدایہ
کے بعض شارحین نے تو صراحت کر دی ہے کہ ظاہر الروایہ اور روایت الاصول
میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نوادر کی روایت ظاہر الروایہ نہیں ہو
سکتی۔'' (ابن کمال پاشا کی عبارت پوری ہوئی)

وضاحت:

ابن کمال پاشا کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ روایت الاصول اور ظاہر الروایہ میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ روایت الاصول خاص ہے اور ظاہر الروایہ عام۔ کیونکہ روایت الاصول امام محمدؒ کی چھ کتابوں کے مسائل ہی کو کہا جاتا ہے اور ظاہر الروایہ عام طور پر تو کتب ستہ کی روایات کو کہا جاتا ہے۔ مگر کبھی نوادر کی روایات کو بھی ظاہر الروایہ کہہ دیا جاتا ہے۔

جواب:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ آپ سے یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ محیط اور ذخیرہ کا یہ قول کہ: ''یہ حسنؒ کی امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے۔'' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اصول کی روایت کے خلاف ہوں۔ کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ اس کو حسنؒ بھی امام ابو حنیفہؒ سے نوادر کی کتابوں میں روایت کرتے ہوں اور امام محمدؒ نے بھی اس کو کتب اصول میں روایت کیا ہو............اور حسنؒ کی روایت ذکر کرنے کی وجہ صرف یہ ہو کہ اس میں اضطراب نہیں ہے کیونکہ انہوں نے خود اس کی صراحت کی ہے کہ امام محمدؒ کی روایتیں مختلف ہیں۔ پس سرخسیؒ کا یہ کہنا کہ وہ ظاہر الروایہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امام محمدؒ نے اس کو کتب اصول میں ذکر کیا ہے کیونکہ امام محمدؒ نے اصول میں امام اعظمؒ کی جو مختلف روایتیں ذکر کی ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا کہ نوادر کی روایت بھی کبھی ظاہر الروایہ ہوسکتی ہے صحیح نہیں ہے۔

ہاں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نوادر کی جو روایتیں کتب اصول میں بھی مذکور ہیں۔ جیسے یہ

مسئلہ...... وہ ظاہر الروایہ ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ کسی مسئلہ کے نوادر میں مذکور ہونے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ کتب اصول میں نہ ہو۔

ابن کمال پاشا کی بات تو صرف اس صورت میں درست ہوسکتی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ یہ مسئلہ ظاہر الروایہ کی کتابوں میں کہیں مذکور نہیں جب کہ محیط اور ذخیرہ کی عبارتیں اس پر دلالت نہیں کرتیں اور اندریں صورت ہدایہ کے شارحین پر جن کا کلام ہماری باتوں کی تائید کرتا ہے۔غفلت کا الزام لگانا بھی درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

سِیَرُ کے معنی:

سِیَرُ سِیْرَۃٌ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں'' کاموں کا انداز'' اور اصطلاح میں آنحضرت ﷺ کا جنگوں میں جو طریقہ تھا وہ سیرت کہلاتا ہے۔ ہدایہ (ج۲ص۲۵۳) میں ایسا ہی ہے۔ اور مُغْرِبْ (ج۱ص۴۲۷) میں ہے کہ:

''عرف عام میں السیر الکبیر کہا جاتا ہے۔ حالانکہ سیر غیر ذوی العقول کی جمع ہے۔ پس صفت کبیرۃ آنی چاہیے۔ مگر لوگ مذکر صفت لاتے ہیں۔ کیونکہ السیر مضاف کے قائم مقام ہے اور وہ ''کتاب'' ہے۔ اور تقدیر عبارت کتاب السیر الکبیر ہے۔ جیسے عرف عام میں صلوٰۃ الظہر کہا جاتا ہے۔ جس کی تقدیر عبارت صلوٰۃ وقت الظہر ہے۔ الظہر کو مضاف کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔ اور سیر الکبیر (مرکب اضافی) غلط ہے جامع الصغیر اور جامع الکبیر غلط ہیں۔''

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہوا کہ اَلسِّیَرُ الْکَبِیْر میں لفظ سیر سین کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور وہ سیرۃ کی جمع ہے سیر سین کے زبر اور یاء کے سکون کے ساتھ نہیں ہے جو مفرد لفظ ہے پس بعض ناواقف لوگ جو السَیْرُ الْکَبِیْر کہتے ہیں وہ غلط ہے۔

۱۷- وَاشْتَهَرَ الْمَبْسُوْطُ بِالْاَصْلِ وَذَا لِسَبقِهِ السِّتَّةَ تَصْنِيْفًا' كَذَا

۱۸- اَلْجَامِعُ الصَّغِيْرُ بَعْدَهٗ' فَمَا فِيْهِ عَلَى الْاَصْلِ' لِذَا تَقَدَّمَا

۱۹- وَاٰخِرُالسِّتَّةِ تَصْنِيْفًا وَرَدْ اَلسِّيَرُالْكَبِيْرُ' فَهُوَ الْمُعْتَمَدْ

ترجمہ: (۱۷) اور مبسوط اصل (جڑ بنیاد) کے نام سے مشہور ہوئی ہے اور یہ بات۔ اس کی تصنیف

کے چھ میں مقدم ہونے کی وجہ سے ہے (پس گویا وہ باقی کتابوں کی بنیاد ہے) اسی طرح۔

(۱۸) مبسوط کے بعد جامع صغیر (باقی کتابوں سے مقدم) ہے۔لہٰذا جو بات جامع صغیر میں ہے۔ وہ اسی وجہ سے مبسوط سے مقدم ہے یعنی چونکہ جامع صغیر کی تصنیف بعد میں ہے اس لیے وہ بمنزلہ ناسخ ہے اور بوقت تعارض اس کے اقوال اصل کے اقوال سے مقدم ہوں گے۔

(۱۹) اور منقول ہے کہ چھ میں آخری تصنیف۔ سیر کبیر ہے پس وہی معتمد علیہ ہے۔

تشریح:

ذا اسم اشارہ کو نہ اصلاً مشار الیہ۔ سبق مصدر مضاف الی الفاعل' الستہ مفعول بہ تصنیفا تمیز ہے جو نسبت کے ابہام کو دور کرنے کے لیے ہے۔ کذا کا تعلق آئندہ شعر سے ہے۔ مصرعہ رابع کی سلیس عبارت اس طرح ہے۔ فلھذا ما فی الجامع الصغیر تقدم علی الاصل مصرعہ خامس میں تصنیفا بھی تمیز ہے۔

اصول اور غیر اصول کی روایتیں:

پہلے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ ظاہر الروایۃ کی کتابیں ''اصول'' کہلاتی ہیں۔ ہدایہ باب التیمم میں ہے وعن ابی حنیفۃ وابی یوسف فی غیر روایۃ الاصول الخ اس کی شرح میں ہدایہ کے شارحین لکھتے ہیں کہ:

> ''روایت الاصول سے مراد جامع صغیر' جامع کبیر' زیادات اور مبسوط کی روایتیں ہیں اور روایت غیر اصول سے مراد نوادر' امالی' رقیات' کیسانیات اور ہارونیات کی روایتیں ہیں۔'' (عنایہ ج ا ص ۱۲۰)

اور فقہاء بارہا کہتے ہیں کہ ذکرہ محمد فی الاصل اور شارحین اس کی تفسیر مبسوط سے کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ لفظ اصل جب مفرد ہو تو اس سے مبسوط مراد ہوتی ہے۔ اصول کی سب کتابوں میں سے مبسوط ہی اس نام کے ساتھ مشہور ہے۔ بحر رائق باب[1] صلوٰۃ العیدین میں غایۃ البیان (۴) سے نقل کیا ہے کہ:

> ''اصل کو اصل اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے لکھی گئی ہے۔ پھر جامع

---

[1] البحر الرائق میں یہ عبارت مجھے نہیں ملی البتہ اس کے حاشیہ منحۃ الخالق میں علامہ شامی نے النہر الفائق سے نقل کی ہے دیکھئے بحر۔ ج ۲ ص ۱۵۸۔

صغیر پھر جامع کبیر پھر زیادات لکھی گئی ہیں۔''

نیز بحر رائق میں یہ بھی ہے کہ:

''جامع صغیر کو امام محمدؒ نے اصل کے بعد لکھا ہے اس لیے جو مسئلہ جامع صغیر میں ہو گا وہی معتمد علیہ ہوگا۔'' (بحر ج ۱ ص ۱۵۸)

جامع صغیر کی وجہ تصنیف:

جامع صغیر لکھنے کی تقریب یہ بنی تھی کہ جب امام محمدؒ مبسوط کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے خواہش کی کہ وہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں جس میں ان کی سند سے امام اعظمؒ کے اقوال ذکر کیے جائیں اور ان کی کنیت استعمال نہ کی جائے بلکہ نام یعقوب لکھا جائے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے تعمیل حکم کی اور کتاب تیار کر کے امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا۔

جامع صغیر کا تعارف:

جامع صغیر ایک بابرکت کتاب ہے۔ اس میں بزدوی رحمہ اللہ (۲۱) کے بیان کے مطابق ایک ہزار پانچ سو بتیس (۱۵۳۲) مسائل ہیں اور بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ باوجود جلالت شان کے' ہمیشہ سفر و حضر میں یہ کتاب ساتھ رکھتے تھے اور علی رازی رحمہ اللہ (۷۳) فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اس کتاب کو سمجھ لے وہ احناف میں فہیم ترین آدمی ہے۔ اور احناف جب تک اس کتاب میں امتحان نہیں لیتے تھے کسی کو عہدۂ قضا پر فائز نہیں کرتے تھے۔

اور غایۃ البیان (۴) میں فخر الاسلام بزدوی (۲۱) سے نقل کیا ہے کہ جب امام ابو یوسفؒ کے سامنے جامع صغیر پیش کی گئی تو آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ''ابو عبداللہ (یعنی امام محمد) نے میرے بیان کئے ہوئے مسائل خوب محفوظ کیے ہیں[۱]...... امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ''مجھے یہ مسائل اچھی طرح یاد ہیں البتہ ان کو سہو ہو گیا ہے۔'' یہ کل چھ مسائل ہیں ان کو البحر الرائق باب الوتر والنوافل ج ۲ ص ۶۱ میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

[۱] یہاں رسم المفتی میں ترکہ ہے۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۵۶۱ میں بحوالہ سرخسیؒ یہ الفاظ ہیں۔ الا انہ اخطأفی ثلاث مسائل (مگر ان سے تین مسائل میں چوک ہو گئی ہے)

صغیر وکبیر میں فرق:

بحر بحث تشہد (ج ۱ص ۳۳۱) میں ہے کہ جن کتابوں کے نام میں لفظ صغیر ہے وہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی متفقہ کتابیں ہیں اور جن کتابوں کے نام میں لفظ کبیر ہے وہ امام ابو یوسفؒ کو نہیں دکھلائی ہیں۔ اور محقق ابن امیر حاج حلبی (۴۷) نے منیۃ المصلی کی شرح حلیۃ المجلی میں تسمیع کی بحث میں لکھا ہے کہ:

''امام محمد نے اپنی اکثر کتابیں امام ابو یوسفؒ کے سامنے پڑھی ہیں۔ مگر جن کتابوں کے نام میں لفظ کبیر ہے وہ امام محمد کی اپنی تصنیفات ہیں جیسے کتاب المضاربة الکبیر کتاب المزارعة الکبیر' کتاب الماذون الکبیر' الجامع الکبیر اور السیر الکبیر ا ھ''

فائدہ:

علامہ شامی رحمہ اللہ نے ردالمحتار ج ۱ص ۴۷ میں لکھا ہے کہ صغیر نامی کتابیں امام محمدؒ کی امام ابو یوسفؒ سے روایتیں ہیں اور کبیر نامی کتابیں امام محمدؒ کی براہ راست امام اعظم سے روایتیں ہیں۔

متفق علیہ مسائل:

محقق ابن الہمام (۳۹) کے شاگرد علامہ قاسم (۱۰) کے فتاویٰ میں علامہ ابن الہمام کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے کہ جن مسائل میں امام محمد رحمہ اللہ اپنی کتابوں میں اختلاف ذکر نہیں کرتے وہ ائمہ ثلاثہ کی متفق علیہ رائے ہوتی ہے۔

سیر کبیر کی وجہ تصنیف:

امام شمس الائمہ سرخسیؒ (۴۰) نے شرح سیر کبیر کے شروع میں لکھا ہے کہ سیر کبیر امام محمدؒ کی سب سے آخری فقہی تصنیف ہے (ج ۱ص ۱) پھر آگے لکھا ہے کہ سیر کبیر لکھنے کی تقریب یہ بنی کہ امام محمدؒ کی سیر صغیر شام کے عالم امام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی (۵۹) کو پہنچی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس کی تصنیف ہے؟ بتایا گیا کہ عراق کے عالم امام محمدؒ کی ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا کہ:

''اہل عراق کو اس باب میں تصنیف کا کیا حق ہے؟ ان لوگوں کو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کی جنگوں کے احوال معلوم نہیں ہیں۔ غزوات شام اور حجاز میں

ہوئے ہیں نہ کہ عراق میں، وہ تو نیا فتح شدہ علاقہ ہے۔''

امام اوزاعی کا یہ تبصرہ جب امام محمدؒ کو پہنچا تو ان کو بہت طیش آیا اور یکسو ہو کر سیر کبیر لکھی۔ کہتے ہیں کہ جب یہ دوسری کتاب امام اوزاعی کو پہنچی تو فرمایا کہ:

''اگر مصنف نے اس کتاب میں حدیثیں شامل نہ کی ہوتیں تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنی طرف سے علم ایجاد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اجتہاد میں صحیح جواب کا رخ متعین کر دیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے کہ ہر علم والے پر بڑا علم والا ہے۔''[1]

پھر امام محمد رحمہ اللہ نے خدام کو حکم دیا کہ سیر کبیر کو ساٹھ رجسٹروں میں لکھا جائے اور بیل گاڑی میں لاد کر دربار شاہی میں پیش کیا جائے۔ بادشاہ کو یہ کتاب بہت پسند آئی اور اس نے اس کتاب کو اپنے زمانہ کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیا۔

اور علامہ بیری (۳۱) کی شرح اشباہ میں ہے کہ:

''ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو مجتہد (مقید) کے لیے افضل اور بہتر یہ ہے کہ دلائل میں غور وفکر کرے اور اس کے نزدیک جو بات راجح ثابت ہو اس کو لے اور مقلد (محض) آخری تصنیف کو لے۔ اور آخری تصنیف سیر کبیر ہے البتہ اگر مشائخ متاخرین نے آخری تصنیف کے برخلاف قول کو اختیار

---

[1] سرخسیؒ نے سیر کبیر کی تصنیف کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہے کیوں کہ امام محمدؒ کی وفات ۱۸۹ھ میں اور امام اوزاعی کی ۱۵۷ھ میں ہوئی ہے یعنی امام محمد رحمہ اللہ سے ۳۲ سال قبل اور یہ بات بہت ہی مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ امام محمدؒ کی آخری تصنیف وفات سے اتنا عرصہ قبل وجود میں آ گئی ہو اور اس کے بعد امام محمدؒ جیسے کثیر التصانیف (لکھاڑ) مصنف نے کچھ نہ لکھا ہو۔ نیز یہ بات بھی فی نفسہ بہت دلچسپ ہے کہ: سیر کبیر آخری تصنیف ہے پس وہی معتمد علیہ ہوگی'' مگر جب اس پر غور کیا جائے کہ سیر کبیر کا موضوع خاص ہے وہ صرف اسلام کے حربی نظام سے بحث کرتی ہے تو یہ بات بھی کچھ نتیجہ خیز نہیں رہتی مثلاً کتاب الاصل اور جامع صغیر کا موضوع پوری شریعت اور اس کے تمام احکام ہیں اس لئے اگر کوئی مسئلہ جامع صغیر میں اصل کے برخلاف ہو تو اعتماد جامع صغیر پر کیا جائے گا کیوں کہ وہ بعد کی تصنیف ہے مگر سیر کبیر گو بعد کی تصنیف ہے مگر اس کے مسائل کا دیگر کتابوں کے مسائل سے تعارض نہیں ہو سکتا کیونکہ موضوع عام خاص بلکہ علیحدہ علیحدہ ہے باقی کتابوں میں حربی نظام سے بحث نہیں کی گئی ہے رہی سیر صغیر تو وہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا ہو تو پھر اسی پر عمل واجب ہے چاہے وہ امام زفر رحمہ اللہ (۷۸) ہی کا قول کیوں نہ ہو۔"

۲۰- وَيَجْمَعُ السِّتَّ كِتَابُ الْكَافِيْ لِلْحَاكِمِ الشَّهِيْدِ' فَهُوَالْكَافِيْ

۲۱- اَقْوٰى شُرُوْحِهِ الَّذِىْ كَالشَّمْسِ مَبْسُوْطُ شَمْسِ الْأُمَّةِ السَّرَخْسِىْ

۲۲- مُعْتَمَدُ النَّقُوْلِ' لَيْسَ يُعْمَلُ بِخُلْفِهٖ' وَلَيْسَ عَنْهُ يُعْدَلُ

ترجمہ: (۲۰) اور اصول ستہ کو کتاب الکافی جمع کرتی ہے۔ جو حاکم شہیدؒ کی ہے' پس وہی کافی ہے۔
(۲۱) اس کی نہایت عمدہ شرح جو سورج کی طرح ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط ہے۔
(۲۲) وہ نقل مذہب میں قابل اعتماد ہے' نہیں عمل کیا جائے گا۔ اس کے خلاف قول پر اور نہ اس سے روگردانی کی جائے گی۔

تشریح:

چوتھے مصرع میں ضرورت شعری کی وجہ سے شمس الامہ باندھا گیا ہے اصل لقب شمس الائمہ (اکابر علماء کے سرتاج) ہے۔ معتمد (اسم مفعول) نائب فاعل کی طرف مضاف ہے اعتمد علیہ: بھروسہ کرنا۔ خلف بمعنی خلاف ہے۔ عدل عنہ: ہٹ جانا' روگردانی کرنا۔

حاکم شہیدؒ کی کافی:

فتح القدیر وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ کتاب الکافی میں امام محمدؒ کی وہ سب باتیں جمع کر دی گئی ہیں جو اصول ستہ میں ہیں' جو ظاہر روایت کی کتابیں ہیں۔ اور علامہ ابراہیم بیری رحمہ اللہ کی شرح اشباہ (۳۱) میں ہے کہ:

"یہ بات جان لیں کہ مسائل الاصول کی کتابوں میں سے حاکم شہید رحمہ اللہ کی کتاب الکافی ہے اور وہ نقل مذہب میں قابل اعتماد کتاب ہے۔ مشائخ کی ایک جماعت نے اس کی شرحیں لکھی ہیں' جن میں شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ بھی ہیں' ان کی شرح مبسوط سرخسی" کے نام سے مشہور ہے۔"

مبسوط سرخسی کا مرتبہ:

شیخ اسماعیل نابلسیؒ (۴۷) لکھتے ہیں کہ علامہ طرسوسیؒ (۵۰) نے فرمایا ہے کہ جو بات مبسوط سرخسی کے خلاف ہو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ صرف اسی کی طرف میلان' اسی کے

مطابق فتویٰ اور اسی پر اعتماد ضروری ہے۔ اور علامہ تقی الدین بن عبدالقادر تمیمیؒ نے الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ (۶۰) میں مبسوط سرخسیؒ کی تعریف میں بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ ان میں سے کسی کے یہ دو شعر ہیں:

۱- عَلَيْکَ بِمَبْسُوْطِ السَّرَخْسِی' فَاِنَّهٗ هُوَ الْبَحْرُ' وَالدُّرُّالْفَرِیْدُ مَسَائِلُهٗ

۲- وَلَا تَعْتَمِدْ اِلَّا عَلَیْهِ' فَاِنَّهٗ یُجَابُ بِاِعْطَاءِ الرَّغَائِبِ سَائِلُهٗ

ترجمہ: (۱) مبسوط سرخسی کو مضبوط پکڑ' کیوں کہ وہ۔ ہی سمندر ہے' اور اس کے مسائل ہی یکتا موتی ہیں۔

(۲) اور صرف اسی پر بھروسہ کر' کیونکہ وہ۔ جواب دیا جاتا ہے رغبتیں دینے کے ذریعہ اس کا سائل یعنی اسی سے ہر سائل کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

اور علامہ شیخ محمد ہبۃ اللہ بعلی اشباہ کی شرح (۳۱) میں لکھتے ہیں کہ:

''مبسوط امام کبیر محمد بن احمد[1] بن ابی سہل سرخسی رحمہ اللہ (۲۰) کی تصنیف ہے۔ آپ کا شمار اکابر علماء میں ہے۔ آپ علم کلام کے ماہر' علم فقہ کے شناور اور علم اصول فقہ کے زبردست عالم تھے۔ شمس الائمہ حلوائی (۱۹) کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہے ہیں اور ان سے پڑھ کر فاضل ہوئے ہیں تا آنکہ وہ اپنے زمانہ میں علم النظر والاستدلال میں سب سے فائق ہو گئے تھے اور تصنیفات شروع کر دی تھیں۔ مبسوط کی تقریباً پندرہ جلدیں یعنی نصف کتاب اوزجند کے جیل خانہ میں املاء کرائی ہیں۔ آپ کو جیل ایک ایسی بات کی وجہ سے جانا پڑا تھا جو آپ نے خیرخواہی کے جذبہ سے کہی تھی۔ آپ کی وفات ۴۹۰ھ میں ہوئی ہے۔''

فقہ حنفی کی مبسوطیں:

فقہ حنفی میں بہت سی مبسوطیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی مبسوط امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط جو الاصل کہلاتی ہے۔ جرجانی (۵۳) کی خواہرزادہ (۷۱) کی شمس الائمہ حلوانی (۱۹) کی ابوالیسر بزدوی (۲۱) کی ان کے بھائی علی بزدوی (۲۱) کی۔ سید ناصر الدین سمرقندی کی اور ابواللیث نصر بن محمد (۵۱) کی مبسوطیں اور جہاں مبسوط مطلق بولی جائے تو علامہ

---

[1] امام سرخسی کے والد کا صحیح نام احمد ہے' رسم المفتی میں محمد ہے جو صحیح نہیں ہے۔

سرخسیؒ کی مبسوط مراد ہوتی ہے جو کافی کی شرح ہے۔

حاکم شہید اور کافی:

اور کافی حاکم شہید رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ آپ بڑے عالم تھے۔ اسم گرامی محمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ ہے آپ کو بخاریٰ کا عہدہ قضا سپرد کیا گیا تھا۔ پھر خراسان کے امیر حمید[1] نے آپ کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ آپ نے بہت سے محدثین سے حدیث سُنی ہے۔ اور امام محمدؒ کی کتابوں کو اپنی اس مختصر (کافی) میں جمع کیا ہے۔ ذہبی رحمہ اللہ (۷۶) نے آپ کے احوال لکھے ہیں اور مدح سرائی کی ہے اور حاکم ابو عبداللہ صاحب مستدرک (۸۳) نے تاریخ نیشا پور میں لکھا ہے کہ:

> ''میں نے محدثین احناف میں' جن سے میں نے حدیث پڑھی ہے' حاکم شہید سے بڑا حدیثوں کا حافظ قواعد تحدیث سے واقف' اور حدیثوں کو سمجھنے والا نہیں دیکھا''

آپ کو ربیع الآخر ۳۳۴ھ میں بحالت سجدہ قتل کیا گیا۔ میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ حاکم شہید کی تصنیفات میں مختصر' منتقی اور اشارات وغیرہ بھی ہیں اور سرخسیؒ کا یہ قول کہ: ''پھر میں نے مختصر کی شرح کرنا مناسب خیال کیا'' اس پر دلالت نہیں کرتا کہ سرخسی کی مبسوط کافی کی نہیں بلکہ مختصر کی شرح ہے' جیسا کہ اشباہ کے حاشیہ میں علامہ خیر الدین رملی (۲۸) کو وہم ہوا ہے۔ کیونکہ کافی بھی مختصر ہے پہلے یہ بات آ چکی ہے کہ اس میں ظاہر روایت کی کتابوں کی تلخیص کی گئی ہے۔ اور غایۃ البیان (۴) میں بکثرت کافی کے اقتباسات اس جملہ سے شروع ہوئے ہیں۔ قال الحاکم الشہید فی مختصرہ المسمیٰ بالکافی اس سے معلوم ہوا کہ کافی کو بھی مختصر کہتے ہیں واللہ اعلم۔

متعدد شمس الائمہ:

علامہ شامی نے منہیہ میں ایک فائدہ لکھا ہے کہ متعدد علماء احناف شمس الائمہ کے لقب سے متعارف ہوئے ہیں۔ مثلاً شمس الائمہ حلوانی (۱۹) اور ان کے شاگرد شمس الائمہ سرخسی (۲۰)

---

[1] اعلام اور فوائد بہیہ میں امیر حمید ہے اور رسم المفتی میں امیر مجید واللہ اعلم بالصواب۔

[2] آپ ایک اوسط سے امام احمد رحمۃ اللہ کے شاگرد ہیں اور مستدرک حاکم کے مصنف حاکم ابو عبداللہ کے استاذ ہیں ۱۲

اور شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری (۸۴) اور شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری (۸۵) اور ان کے صاحبزادے شمس الائمہ عماد الدین عمر بن بکر زرنجری (۸۶) اور شمس الائمہ بیہقی (۸۷) اور شمس الائمہ اوزجندی جن کا نام محمود ہے۔ بارہا آپ کو شمس الاسلام کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے (۸۸) (یہ فائدہ الدرر والغرر کے حاشیہ نوح[1] آفندی فصل المہر میں ہے)

القاب[2] میں مبالغہ:

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ (۲۶) نے فوائد بہیہ کے آخر میں لکھا ہے کہ عراق کے فقہاء میں عام طور پر القاب میں سادگی تھی۔ وہ کاروبار، محلّہ، قبیلہ یا گاؤں کی طرف نسبت کرنے پر اکتفاء کیا کرتے تھے جیسے جصاص (گچ والا) قدوری (ہانڈی والا) طحاوی (طحا گاؤں کا باشندہ) کرخی (مقام کرخ کا باشندہ) صیمری (صیمرہ کا باشندہ) اور خراسان اور ماوراء النہر میں عام طور پر القاب میں مبالغہ کیا جاتا تھا اور دوسروں پر ترفع ظاہر کیا جاتا تھا۔ جیسے شمس الائمہ، فخر الاسلام، صدر الاسلام، صدر جہاں، صدر الشریعہ وغیرہ اور یہ صورت زمانہ مابعد میں پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے زمانہ کے لوگ اس قسم کی باتوں سے پاک تھے۔ ابو عبداللہ قرطبی (۸۹) اسماء اللہ الحسنیٰ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

> ''قرآن وحدیث سے اپنا تزکیہ کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ مصر کے علاقہ میں اور دیگر بلاد عرب وعجم میں جو رواج ہوگیا ہے کہ اپنے لیے ایسی صفات استعمال کی جاتی ہیں جو تزکیہ اور تعریف پر دلالت کرتی ہیں، وہ بھی اس ممانعت میں داخل ہے جیسے زکی الدین، محیی[3] الدین، علم الدین اور اسی طرح کے دیگر القاب۔''

اور محیی الدین نحاس (۹۰) کی تنبیہ الغافلین میں جہاں منکرات کا تذکرہ ہے، لکھا گیا ہے کہ:

---

[1] علامہ نوح بن مصطفیٰ رومی حنفی (متوفی ۱۰۷۰ھ) گیارھویں صدی کے صوفی اور حنفی فقیہ ہیں ان کا الدرر والغرر پر حاشیہ ہے جس کا نام نتائج النظر ہے جو مخطوطہ ہے آپ کی اور بھی متعدد تصنیفات ہیں (اعلام ج ۸ ص ۵۱ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۹۹)

[2] یہ عنوان اضافہ ہے۔

[3] محی (اسم فاعل) احیاء: زندہ کرنا صفت باری تعالیٰ ہے المحیی زندہ کرنے والا حیات بخشنے والا۔

''منکرات میں سے وہ بھی ہے جو وبا کی طرح پھیل گیا ہے یعنی وہ جھوٹ جو زبانوں پر رائج ہو گیا ہے اور وہ خود ساختہ القاب ہیں۔ جیسے محی الدین، نور الدین، عضد الدین، غیاث الدین معین الدین اور ناصر الدین وغیرہ۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو پکارتے وقت اور تعریف کرتے وقت اور حکایت کرتے وقت زبانوں پر بار بار آتا ہے۔ یہ سب دین میں امر منکر اور بدعت ہے''

مذکورہ بالا اقتباسات نقل کرنے کے بعد مولانا لکھنوی رحمہ اللہ نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

''یہ بات یعنی مذکورہ بالا القاب[1] کا منکر و بدعت ہونا اس صورت میں ہے۔ جب کہ صاحب لقب اس کا اہل نہ ہو یا اہل تو ہو مگر اس نے اپنا لقب بطور تزکیہ رکھا ہو۔ (فوائد بہیہ ص ۱۰۰)

۲۳- واعْلَمْ بانّ عنْ ابیْ حنیْفۃْ جاءَ تْ رَوَایاتٌ غدتْ مُنِیْفۃْ

۲۴- اختارَمنْها بعْضَها والْباقِیْ یخْتارُمنْہُ سآئِرُ الرِّفاقِ

۲۵- فلمْ یکنْ لغیْرِہ جوابٌ کمَا علیْہِ اقْسَمَ الاصْحابُ

ترجمہ: (۲۳) اور جان لیجئے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے۔ آئی ہیں ایسی روایتیں جو نمایاں ہوگئی ہیں۔ (۲۴) ان میں سے بعض کو امام اعظم رحمہ اللہ نے چن لیا ہے اور باقی۔ منتخب کرتے ہیں ان میں سے باقی ساتھی (تلامذہ) (۲۵) پس فقہ حنفی میں امام اعظم رحمہ اللہ کے علاوہ کسی کا کوئی قول نہیں۔ جیسا کہ یہ بات قسم کھا کر کہی ہے امام صاحب کے تلامذہ نے۔

تشریح:

غدیٰ (فعل ناقص) بمعنی صار، منیفۃ (اسم فاعل) اناف علی الشیٔ: بلند ہونا، نمایاں ہونا۔ غدیٰ اسم وخبر سے مل کر روایات کی صفت ہے۔ اختار اختیارا: منتخب کرنا، چن لینا۔ رفاق۔ رفقۃ کی جمع ہے بمعنی ساتھیوں کی جماعت۔

مجتہد کے مختلف اقوال اور ضابطۂ ترجیح:

یہ بات جان لیں کہ اصول فقہ کی کتابوں میں اکثر علماء سے جو منقول ہے وہ یہ ہے کہ ایک

---

[1] ہمارے عرف میں یہ القاب بطور اعلام (ناموں کے) مستعمل ہیں اس لیے ممنوع نہیں ہیں۔ ہمارے محاورات میں القاب عالیہ کی مثالیں مفتی اعظم، محقق بے بدل، خطیب عصر، علامہ زماں وغیرہ ہیں ۱۲

مسئلہ میں مجتہد کے دو قول بر بنائے تعارض نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر دو قولوں میں سے آخری قول معلوم ہے تو اس کو رجوع قرار دینا متعین ہوگا ورنہ بعد کے مجتہد پر بشہادت قلب ایک قول کو ترجیح دینا واجب ہوگا' جیسا کہ احناف کی بعض مشہور کتابوں میں ہے اور بعض میں ہے کہ اگر اقوال کی تاریخ معلوم نہ ہو تو اگر دو قولوں میں سے ایک کے ساتھ کوئی ایسی بات امام سے منقول ہے جو اس کو قوی کرتی ہو۔ تو وہی قول امام کے نزدیک صحیح ہے۔ ورنہ اگر کوئی ایسا مقلد موجود ہے جو اجتہاد فی المذہب کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے تو وہ گزشتہ ترجیحات کے ذریعہ ترجیح دے گا' اگر کوئی مرجح موجود ہو' ورنہ دل کی گواہی سے جس قول پر چاہے عمل کرے اور اگر کوئی عام آدمی ہے تو وہ علم میں برتر اور تقویٰ میں بہتر مفتی کے فتویٰ کی پیروی کرے اور اگر فقہ کا طالب علم ہے تو وہ متاخرین کی پیروی کرے اور اس قول پر عمل کرے جو اس کے نزدیک زیادہ درست اور زیادہ مبنی بر احتیاط ہے۔ محقق ابن ہمام کی تحریر میں ایسا ہی ہے۔

وضاحت:

علامہ شامی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا پورا مضمون علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی مشہور کتاب التحریر سے اور اس کے شارح علامہ ابن امیر حاج حلبی رحمہ اللہ کی **التقریر و التحبیر** (ج ۳ ص ۳۳۳) سے نقل کیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ کسی مجتہد کے بیک وقت کسی مسئلہ میں دو یا زیادہ متعارض اقوال نہیں ہو سکتے' عقلاء کے کلام میں تعارض پسندیدہ بات نہیں ہے پس اگر کسی مسئلہ میں مجتہد کے مختلف اقوال مروی ہوں تو ان پر ترجیح ضروری ہے[1] تا کہ تعارض رفع ہو جائے اور وجوہ ترجیح درج ذیل ہیں۔

(۱) اگر مختلف اقوال میں سے کسی قول کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ امام کا بعد کا قول ہے تو وہی مرجوع الیہ قول ہوگا اور سابق قول یا اقوال کالعدم سمجھے جائیں گے۔

(۲) اور اگر آخری قول معلوم نہ ہو سکے تو دیکھا جائے کہ کسی قول کے ساتھ کوئی ترجیحی

---

[1] امام العصر علامہ کشمیری قدس سرہ نے فیض الباری۔ ج ۱ ص ۳۵۷ میں بیان فرمایا ہے کہ ایک امام کے مختلف اقوال میں ترجیح سے بہتر تطبیق ہے اور اخیر میں لکھا ہے کہ: ''میرے نزدیک امام صاحب کی روایات میں بھی حتی الامکان تطبیق دینے کی کوشش کرنی چاہیے الا یہ کہ کسی دلیل سے دوسری صورت راجح قرار پائے۔ یہ ایک مفید بحث ہے شائقین اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔''

اشارہ موجود ہے یا نہیں؟ مثلاً کسی قول کو خود امام نے ارفق للناس' اوفق بالزماں یا اشبہ بالصواب کہا ہوتو اسی قول کو اختیار کیا جائے گا اور وہی امام کا صحیح قول سمجھا جائے گا۔

(۳) اور اگر کسی قول کے ساتھ ترجیحی اشارہ موجود نہ ہوتو صاحب معاملہ ..... یعنی جن لوگوں کو فتویٰ دینے کے لیے یا عمل کرنے کے لیے کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے وہ تین قسم کے حضرات ہو سکتے ہیں۔ (۱) مجتہد فی المذہب' (۲) محض فقیہ (مفتیان زمانہ) (۳) اور عام مسلمان۔ تینوں کے احکام درج ذیل ہیں:

(الف) مجتہد فی المذہب اصول فقہ میں تعارض ادلہ کی بحث میں جو وجوہ ترجیح بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کسی وجہ کے ذریعہ کسی ایک قول کو ترجیح دے گا اور اگر کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہوتو اپنے دل کی گواہی سے جس قول کو راجح سمجھے اس پر عمل کرے اور اس پر فتویٰ دے۔

(ب) اور محض فقیہ (اور عصر حاضر کے سب مفتی اسی درجہ میں ہیں الا ماشاء اللہ) متاخرین کی ترجیحات کی پیروی کرے یعنی متاخرین نے جس قول پر فتویٰ دیا ہے اس کو راجح سمجھے اور اس پر فتویٰ دے۔

(ج) اور عام مسلمان اپنے زمانہ کے اعلم واتقی مفتی کے فتویٰ کی پیروی کریں۔ وہ جس قول پر فتویٰ دے اس پر عمل کریں۔

اختلاف اقوال واختلاف روایات میں فرق:

اور یہ بات جان لیں کہ دو روایتوں کا اختلاف دو قولوں کے اختلاف کے قبیل سے نہیں ہے کیوں کہ دو قول تو مجتہد کی صراحت کی وجہ سے ہوتے ہیں اور دو روایتوں کے اختلاف کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ الغرض دو قولوں کا اختلاف تو منقول عنہ کی طرف سے ہوتا ہے ناقل کی طرف سے نہیں ہوتا اور دو روایتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے (وہ ناقلین کی طرف سے ہوتا ہے' امام کی طرف سے نہیں ہوتا) یہ بات محقق ابن امیر حاج حلبی (۷۴) نے التحریر کی شرح التقریر و التحبیر ج ۳' ص ۳۳۴ میں بیان فرمائی ہے۔

وضاحت:

ایک مثال لیجیے۔ امام اعظم رحمہ اللہ نے ایک وقت میں عورتوں کو قبرستان جانے کی اجازت دی اور دوسرے وقت میں ممانعت فرمائی تو یہ اقوال کا اختلاف ہے جو منقول عنہ کی

طرف سے ہے اور اگر امام صاحب نے تو کسی مسئلہ میں کوئی ایک متعین بات فرمائی ہو مگر ناقلین میں اختلاف ہو گیا ہو کہ امام صاحب نے کیا فرمایا تھا؟ تو یہ روایتوں کا اختلاف ہے۔ پس جو فرق علامہ ابن امیر حاج نے بیان کیا ہے وہ نہایت واضح اور بدیہی ہے۔ مگر مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کیا جائے۔ یعنی قول کی جگہ روایت کو اور اس کے برعکس۔ کیونکہ ان اصطلاحات کے استعمال میں توسع ہے۔ آگے کی ساری الجھن اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ''اقوال'' اور ''روایات'' کی اصطلاحیں ہمیشہ حقیقی معنی میں استعمال نہیں کی جاتیں۔

اختلاف روایات کے چار اسباب:

لیکن[1] ابن امیر حاج نے مذکورہ فرق بیان کرنے کے بعد امام ابو بکر بلیغی کی ''الدرر'' سے نقل کیا ہے کہ امام اعظمؒ سے روایتوں کے اختلاف کی چند وجوہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) بات سننے میں غلطی ہونا۔ مثلاً جب امام صاحب سے کسی معاملہ میں پوچھا گیا تو آپ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ: ''جائز نہیں'' مگر راوی پر بات مشتبہ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے جیسا سنا ویسا نقل کر دیا۔ اور دوسرے راوی نے صحیح بات سنی اور وہی نقل کی تو مسئلہ میں دو روایتیں ہو گئیں۔

(۲) امام صاحبؒ کی ایک رائے تھی جس سے بعد میں آپ نے رجوع کر لیا اور جو راوی امام صاحبؒ کے پاس آتا جاتا تھا اس کے علم میں وہ رجوع آیا اور اس نے آخری رائے نقل کی اور دوسرا راوی جس کا آنا جانا کم تھا یہ آخری رائے اس کے علم میں نہ آ سکی تو اس نے وہی پہلی رائے نقل کی تو مسئلہ میں دو روایتیں پیدا ہو گئیں۔

---

[1] ''لیکن'' استدراک کے لیے ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے یہاں سے جو اعتراض شروع کیا ہے اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

[2] امام ابو بکر بلیغی کا تذکرہ مجھے کہیں نہیں ملا نیز التقریر والتحریر میں بلیغی کی کتاب کا نام ''الغرر'' ہے ''الدرر'' نہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ سب تصحیفات ہیں صحیح نام عبدالرحمٰن بن ابی بکر العینی ہے جن کا لقب زین الدین شہرت ابن العینی سے ہے سن ولادت ۸۲۷ھ اور سن وفات ۸۹۳ھ ہے۔ انہوں نے علامہ قونوی (۲۵) کی درر البحار کی شرح لکھی ہے جس کے بارے میں حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ احسن فیہ و اجاد (کشف الظنون ج ۱ ص ۷۴۶) مذکورہ عبارت غالباً اسی شرح کی ہے واللہ اعلم۔

(۳) امام صاحب نے ایک بات قیاس کی رو سے فرمائی اور دوسری استحسان کی رو سے ایک راوی نے پہلی بات سنی اور اس کو روایت کیا اور دوسرے نے دوسری بات سنی اور اس کو روایت کیا جس کی وجہ سے مختلف اقوال پیدا ہو گئے۔

(۴) کسی مسئلہ میں حکم دو جہتوں سے ہو ایک قضا کی جہت سے اور دوسرا احتیاط (تقویٰ) کی جہت سے اور ہر راوی اسی طرح حکم نقل کرتا ہے جس طرح اس نے سنا ہے (پس اقوال میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے) (ابن امیر حاج کی بات پوری ہوئی)[1]

اقوال وروایات میں فرق پر اعتراض:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ وجہ اول کو چھوڑ کر باقی وجوہ میں دو روایتوں میں اختلاف منقول عنہ کی طرف سے بھی ہوگا۔ کیونکہ ان میں اختلاف امام سے مروی دو قولوں میں اختلاف کی بنیاد پر ہے پس دونوں (یعنی قول اور روایت) ایک ہی قبیل کے ہو گئے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے اور دوسری نوادر کی کتابوں میں بلکہ کبھی دونوں روایتیں اصول کی کتابوں میں ہوتی ہیں جو سب ایک ہی شخص کی تصنیفات ہیں۔ یعنی امام محمد رحمہ اللہ کی۔ پس پہلی وجہ کیوں کر درست ہو سکتی ہے اور دوسری بہت ہی مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ پچھلی دو وجہوں پر اکتفاء کی جائے۔ مگر یہ بات ہر اس جزیہ میں نہیں ہے جس میں روایتیں مختلف ہوں کیوں کہ کبھی ان میں سے ایک روایت ایک مصنف کے یہاں ہوتی ہے اور دوسری دوسرے مصنف کے یہاں (پس اس صورت میں پہلی دو وجہیں بھی درست ہو سکتی ہیں) نیز پچھلی دو وجہوں پر بھی اکتفا وہاں کیا جا سکتا ہے جب کہ مسئلہ میں قیاس و استحسان اور فتویٰ و تقویٰ کی گنجائش ہو۔ غرض جہاں راوی مختلف ہوں وہاں پہلی دو وجہیں بھی درست ہو سکتی ہیں۔[2]

---

[1] ابن امیر حاج نے وجوہ اربعہ نقل کر کے لکھا ہے کہ "یہ بات مخفی نہیں ہے کہ بلغنی کی مراد یہ ہے کہ جہاں دو روایتیں ہوں گی وہاں وجوہ اربعہ میں سے کوئی ایک وجہ ضرور جاری ہوگی۔ ان کی یہ مراد نہیں ہے کہ جہاں بھی دو قول ہوں گے وجوہ اربعہ میں سے ہر وجہ جاری ہو سکے گی۔ لہٰذا ہر جگہ ہر ایک وجہ جاری نہ ہو سکنے میں کوئی مضائقہ نہیں واللہ سبحانہ اعلم (التقریر ج ۳ ص ۳۳۵)

[2] یہی جواب ابن امیر حاج نے لکھی ہے جو گزشتہ حاشیہ میں نقل کی گئی ہے اور اصل اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بلغنی نے لفظ "روایت" توسعاً عام استعمال کیا ہے فرق کا لحاظ کر کے خاص معنی میں استعمال نہیں کیا۔۱۲

اختلاف روایت کے دو اور سبب:

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اختلاف روایت کی وجوہ میں درج ذیل صورتیں بھی ہیں۔

(۱) کسی حکم میں مجتہد کا متردد ہونا بایں وجہ کہ اس کے نزدیک دلائل میں تعارض ہے اور کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں ہے۔

(۲) ایک ہی دلیل کے مدلول ومفہوم میں مجتہد کی رائے کا مختلف ہونا کیوں کہ دلیل کبھی دو یا زیادہ وجوہ کو محتمل ہوتی ہے۔ اس لیے مجتہد ہر احتمال پر ایک جواب کی بنیاد رکھتا ہے۔

راجح قول ہے اور مرجوح روایت:

پھر کبھی مجتہد کے نزدیک ایک احتمال کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے تو وہ احتمال اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے (اور دوسرا مرجوح احتمال روایت کی صورت میں باقی رہ جاتا ہے) فقہاء ایسی صورت میں یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ: ''امام صاحب کا قول (مذہب) یہ ہے اور ان سے ایک روایت یہ ہے۔'' اور کبھی کسی وجہ کو ترجیح حاصل نہیں ہوتی تو دونوں جانب امام کی رائے مساوی رہتی ہے۔ آپ فقہاء کو دیکھیں گے کہ وہ ایک ہی مسئلہ میں امام صاحب سے دو قول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ ان دونوں قولوں کا امام صاحب کے نزدیک مساوی ہونا مفہوم ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں کہ: ''اس مسئلہ میں امام صاحب سے دو روایتیں یا دو قول ہیں۔''

عدم ترجیح کی صورت میں دونوں ہی قول ہیں:

اور ہم پہلے امام قرافی رحمہ اللہ (۹) کے حوالہ سے بیان کر آئے ہیں کہ غیر راجح قول پر فیصلہ کرنا یا فتویٰ دینا نہ مجتہد کے لیے جائز ہے نہ مقلد کے لیے۔ البتہ اگر مجتہد کی نظر میں دلائل متعارض ہوں اور وہ کسی دلیل کو ترجیح نہ دے سکے تو جائز ہے کہ دونوں قولوں میں سے جس پر چاہے فیصلہ کرے۔ کیونکہ اس صورت میں دونوں قول اس کے نزدیک مساوی ہیں۔ وعلی ہذا (یعنی جب دونوں قولوں اور فیصلہ کرنا درست ہے تو) وہ دونوں قول اس مجتہد کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ اور بعض اصولیوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ ایسی صورت میں کوئی بھی قول اس مجتہد کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ نیز بعض حضرات کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ صرف ایک قول کی مجتہد کی طرف نسبت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دوسرے قول سے امام کا رجوع متعین نہیں

ہے اس لیے کہ مفروضہ صورت یہ ہے کہ مجتہد کی رائے میں دونوں پہلو برابر ہیں، کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔

رجوع کے بعد قول باقی نہیں رہتا:

ہاں اگر مجتہد کے نزدیک ایک پہلو راجح ہو جائے، دوسرے پہلو سے رجوع اور اعراض کیے بغیر تو راجح پہلو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا اور دوسرے پہلو کو روایت کے طور پر ذکر کیا جائے گا۔ اور اگر مجتہد دوسرے پہلو سے بالکلیہ اعراض کر لے تو وہ اس کا قول ہی باقی نہیں رہے گا۔ اس صورت میں اس کا قول، صرف راجح پہلو ہوگا۔

رجوع سے اختلاف ختم نہیں ہوتا:

لیکن مجتہد کے رجوع کرنے سے مسئلہ میں اختلاف ختم نہیں ہوتا بعض شوافع نے ایسا ہی بیان کیا ہے اور بعض نے اس کی تائید میں یہ بات پیش کی ہے کہ اگر کسی دور میں لوگ کسی مسئلہ میں اختلاف کرنے کے بعد کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں تو سابق اختلاف کے ختم ہونے کے بارے میں اصولیوں نے دو قول نقل کیے ہیں پس جس مسئلہ میں اجماع نہ ہوا ہو اس میں تو بدرجہ اولیٰ اختلاف سابق ختم نہ ہوگا۔

کیا تعارض ادلہ اختلاف اقوال کا سبب ہو سکتا ہے؟

لیکن ہماری اصول فقہ کی کتابوں میں جو بات مذکور ہے کہ "مجتہد کے کسی مسئلہ میں دو قول ہوں یہ بات ممکن ہی نہیں" جیسا کہ تحریر کے حوالہ سے یہ بات پہلے گزر چکی ہے، یہ بات اس کے منافی ہے کہ تعارض ادلہ کو اختلاف اقوال کا سبب بنایا جائے۔ کیونکہ وہ بات بظاہر اس بات پر مبنی ہے جو علماء نے تعارض ادلہ کی بحث میں ذکر کی ہے کہ جب دو آیتوں میں تعارض ہو تو حدیث کی طرف رجوع کیا جائے اور دو حدیثوں میں تعارض ہو تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے اور صحابہ کے فتاویٰ میں تعارض ہو تو قیاس کی طرف رجوع کیا جائے اور دو قیاسوں میں تعارض ہو اور کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو تو تحری (غور و فکر) سے کام لیا جائے اور دل کی گواہی کے مطابق عمل کیا جائے۔ پھر جب ایک پہلو پر عمل کر لیا تو دوسرے پہلو پر عمل کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی البتہ اگر تحری سے بڑھ کر کوئی دلیل سامنے آ جائے تو دوسرے پہلو پر عمل کیا جا سکتا ہے (غرض جہاں ادلہ میں تعارض ہوگا وہاں مخلص بھی موجود ہوگا پھر تعارض ادلہ اختلاف اقوال کا سبب کیسے

بن سکتا ہے؟)

اور علمائے کرام نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ: ''مجتہد تحری کے بغیر بھی دو پہلوؤں میں سے جس پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔'' چنانچہ امام شافعیؒ کے ہر مسئلہ میں دو یا زیادہ اقوال ہیں اور ہمارے ائمہ سے جو ایک مسئلہ میں دو روایتیں ہیں تو وہ دو وقتوں کی ہیں اس لیے ایک صحیح ہے اور دوسری صحیح نہیں ہے۔ مگر ان میں سے بعد کی روایت معلوم نہیں ہے (یعنی تعارض ادلہ شوافع کے نزدیک تو اختلاف اقوال کا سبب بن سکتا ہے مگر احناف کی تصریحات کے مطابق اس کی گنجائش نہیں) (التقریر والتحبیر ج ۳ ص ۴ بحث تعارض)

بناءً علیٰ ہذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ: ''اس مسئلہ میں امام صاحب سے دو روایتیں ہیں'' یہ بات آخری قول معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کہی جاتی ہے اور جہاں یہ تعبیر آتی ہے کہ فی روایۃ عنہ کذا یعنی امام صاحب سے ایک روایت اس طرح ہے۔ یہ تعبیر وہاں اختیار کی جاتی ہے جہاں فقہاء کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات امام صاحب کا پہلا قول ہے یا بایں وجہ یہ تعبیر اختیار کی جاتی ہے کہ امام صاحب کا وہ قول اصول کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں میں مذکور ہوتا ہے اور یہ دوسری بات اقرب الی الصواب ہے۔

علامہ شامیؒ کی رائے:

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ علماء نے تعارض ادلہ کی بحث میں جو بات بیان فرمائی ہے وہ ناقابل فہم ہے کیوں کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جس مسئلہ میں امام صاحب کی دو روایتیں ہوں اس میں کسی پر بھی عمل جائز نہ ہو۔ یہ بات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے اور کون سی باطل اور نہ ان دو باتوں میں سے کسی کی امام صاحب کی طرف نسبت درست ہو۔ جیسا کہ بعض اصولیوں کے حوالہ سے یہ بات پہلے گزر چکی ہے حالانکہ بے شمار مسائل میں دو روایتیں موجود ہیں۔ اور علماء ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس راجح کو امام صاحب کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں۔ پس ظاہر وہی ہے جو امام بلیغی کے حوالہ سے پہلے گزر چکا کہ اختلاف روایات کی وجوہ متعدد قرار دی جائیں، صرف تعارض ادلہ کو سبب نہ بنایا جائے۔ البتہ ان کی بیان کردہ وجوہ اربعہ کے ساتھ

وہ دو وجہیں بھی بڑھا دی جائیں جو ہم نے ذکر کی ہیں یعنی امام کا دو حکموں میں متردد ہونا اور امام کی رائے میں دو احتمالوں کا ہونا اور کسی دلیل یا تحری وغیرہ سے کسی ایک احتمال کو ترجیح حاصل نہ ہونا (خوب غور کرلیں)

نیز یہ بات بھی مخفی نہیں ہے کہ اختلاف روایات کی یہ وجہ جو ہم نے بیان کی ہے گزشتہ وجوہ اربعہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر کارآمد ہوسکتی ہے کیونکہ وہ اس صورت کو بھی شامل ہے جس میں اختلاف قیاس واستحسان کی وجہ سے ہو یا فتوی اور تقوی کی جہت سے ہو۔

اضافہ:

خلاصہ یہ کہ اختلاف اقوال وروایات کے چھ اسباب ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) راویوں سے امام کی بات سننے میں یا سمجھنے میں غلطی کا ہونا۔

(۲) امام کا اپنے قول سے رجوع کرلینا مگر بعض راویوں کو اس کی اطلاع نہ ہونا۔

(۳) قیاس واستحسان کے تعلق سے مسئلہ میں امام کے دو قول ہونا۔

(۴) فتوی اور تقوی کے تعلق سے مسئلہ میں امام کے دو قول ہونا۔

(۵) دلائل میں تعارض کی وجہ سے امام کا حکم میں متردد ہونا اور دو قول کرنا۔

(۶) کسی دلیل کے مفہوم میں احتمال ہونے کی وجہ سے امام کا دو قول کرنا۔

نوٹ:

اول ودوم اختلاف روایت کے اسباب ہیں اور باقی اختلاف اقوال کے۔

تلامذہ کے اقوال بھی امام صاحب کے اقوال ہیں:

جب مذکورہ بات ثابت ہوگئی تو اب جاننا چاہیے کہ امام ابوحنیفہ نے غایت احتیاط اور کمال تقوی کی وجہ سے اور یہ بات جاننے کی وجہ سے کہ اختلاف آثار رحمت[۱] سے ہے اپنے تلامذہ سے کہہ دیا تھا کہ: ''اگر تمہیں کوئی دلیل مل جائے تو تم اس کے مطابق رائے قائم کرسکتے ہو'' چنانچہ ہر شاگرد امام صاحب سے مروی کسی روایت کو لے لیتا اور اس کو ترجیح دیتا تھا۔ علامہ حصکفیؒ

---

[۱] یہ مشہور حدیث اختلاف امتی رحمۃ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حدیث ان الفاظ سے ثابت نہیں مگر اختلاف اصحابی لکم رحمۃ وارد ہے تخریج کے لیے شامی ج ا ص ۵۰ دیکھیں۔ ۱۲

نے درمختار (ج ۱ ص ۵۰) میں یہ بات نقل[1] کی ہے۔

اور فتاویٰ ولوالجیہ (۹۱) کی کتاب الجنایات میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ "میں نے امام اعظم رحمہ اللہ کی رائے کے خلاف جو بھی قول کیا ہے وہ خود ان کا سابقہ قول ہے" اور امام زفرؒ سے مروی ہے کہ "میں نے جس مسئلہ میں بھی امام ابو حنیفہؒ کی مخالفت کی ہے اور علیحدہ رائے قائم کی ہے وہ خود ان کا قول ہے جس سے انہوں نے رجوع کر لیا ہے"......... یہ اقوال مشیر ہیں کہ امام اعظمؒ کے تلامذہ نے اختلاف کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے رائے اور اجتہاد سے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے ارشاد کی تعمیل ہے اھ

اور الحاوی القدسی (۹۲) کے آخر میں ہے کہ جب امام اعظمؒ کے کسی بھی شاگرد کا قول لیا جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ قول اختیار کر کے امام صاحب کے قول ہی پر عمل کیا۔ کیونکہ امام صاحب کے تمام بڑے تلامذہ سے مثلاً امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ امام زفر اور امام حسن بن زیاد رحمہم اللہ سے یہ بات مروی ہے کہ ہم نے کسی مسئلہ میں جو بھی قول کیا ہے وہ ہماری امام اعظمؒ سے روایت ہے۔ اور ان حضرات نے اپنی اس بات پر مؤکد قسمیں کھائیں ہیں پس اب فقہ حنفی میں نہ کسی کا کوئی جواب محقق ہے نہ مذہب سب ہی امام اعظم کے اقوال ہیں خواہ بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ اور اقوال تلامذہ کی طرف صرف رائے میں توافق کی وجہ سے منسوب کئے گئے ہیں اھ[2]

---

[1] ان توجد لکم دلیل فقولو ابہ کا یہ مطلب لینا کہ اگر تلامذہ کو امام صاحب کے متروک قول کی کوئی قوی دلیل مل جائے تو وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ شاید صحیح نہ ہو اس کا صاف مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تلامذہ پر امام صاحب کے اقوال کی پابندی لازم نہیں اگر کسی کو رائے امام کے خلاف کوئی قوی دلیل مل جائے تو وہ اپنی علیحدہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ پس امام اعظمؒ کے اس ارشاد سے یہ ثابت کرنا کہ تلامذہ کے سب اقوال امام صاحب ہی کے اقوال ہیں شاید درست نہ ہو۔

[2] تلامذہ کا یہ ارشاد کہ "ہمارا ہر قول امام اعظم ہی کا قول ہے" اگر صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو اکثری احوال کے اعتبار سے قرار دیا جائے گا' کیونکہ اب صاحبین کی اکثر کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے نیز عام کتب فقہ کا مطالعہ کرنے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ پھر اصول فقہ کے کئی ایک ضوابط میں صاحبین کا اختلاف ہے اور اصول کے اختلاف کے ساتھ اقوال کیسے متحد رہ سکتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ صاحبین کی صلاحیتیں مجتہد مطلق کے درجہ کی مانی گئی ہیں ایسی بڑی صلاحیتوں والے کوئی نئی بات نہ سوچیں یہ ممکن ہی نہیں ہے واللہ اعلم۔

ایک شبہ:

اگر کوئی کہے کہ جب مجتہد نے کسی قول سے رجوع کرلیا تو وہ اس کا قول ہی باقی نہیں رہا۔ کیونکہ وہ حکم منسوخ کی طرح ہوگیا جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس ایسی صورت میں تلامذہ نے امام صاحبؒ کے قول کے برخلاف جو کچھ کہا ہے وہ امام صاحب کا مذہب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تلامذہ کے اقوال خود ان کے مذاہب ہوں گے۔ پھر ان کو امام صاحب کی طرف کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ حنفی صرف امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو امام صاحب کی طرف منسوب کرکے ''حنفی'' کہا جاتا ہے۔

جواب:

یہ اشکال خود میرے ذہن میں آیا تھا اور میں نے اس کا جواب درمختار کے حاشیہ ردالمحتار (ج ۱ ص ۵۰) میں دے دیا ہے کہ جب امام صاحبؒ نے اپنے تلامذہ کو حکم دیا کہ وہ ان کے اقوال میں سے جس کی ان کو دلیل مل جائے اختیار کرسکتے ہیں تو اب تلامذہ کے اقوال خود امام صاحب کے اقوال ہوگئے۔ کیونکہ تلامذہ کے وہ اقوال ان قواعد پر مبنی ہیں جو خود امام صاحبؒ نے ان کے لیے تجویز کیے ہیں۔ اس لیے امام صاحب کے وہ اقوال بالکلیہ مرجوع عنہ نہیں ہیں۔

صحیح حدیثیں بھی امام صاحب کے اقوال ہیں:

اور اس کی نظیر وہ بات ہے جو علامہ بیریؒ (۳۱) نے شرح اشباہ کے شروع میں شارح وہبانیہ (۹۳) کے والد ماجد[1] اور علامہ ابن الہمام (۳۹) کے استاذ بڑے ابن الشحنہ (۹۴) کی شرح ہدایہ سے نقل کی ہے کہ:

> ''جب حدیث پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اور وہ مذہب کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کیا جائے گا اور وہی امام صاحب کا مذہب ہوگا اور حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے امام صاحب کا مقلد حنفیت سے نہیں نکلے گا کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ: ''جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ میرا مذہب ہے'' علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ (۹۵) نے یہ بات امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ کرام رحمہم اللہ سے نقل کی ہے۔ اھ''

---

1. حواشی فوائد بہیہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن الشحنہ کبیر و صغیر دادا پوتا ہیں واللہ اعلم۔

اور یہی بات امام شعرانی (۹۶) نے بھی چاروں ائمہ سے نقل کی ہے (باقی بات آگے آ رہی ہے)

حدیث پر عمل کے لیے اہلیت شرط ہے:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ امام صاحب کے قول کو چھوڑ کر حدیث شریف پر عمل کرنے کا حق اس شخص کو ہے جو نصوص میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور محکم ومنسوخ نصوص کو پہچان سکتا ہے۔

(یہ بات درمیان میں بطور فائدہ کے تھی اب سلسلہ کلام گزشتہ عنوان سے مربوط ہے)
پس جب کسی مسلک والے دلیل میں غور کریں گے اور امام کا قول چھوڑ کر نص کے مطابق عمل کریں گے تو اس عمل کی نسبت مذہب کی طرف کرنا درست ہے۔ کیونکہ وہ عمل صاحب مذہب کی اجازت سے صادر ہوا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر صاحب مذہب کو اپنی دلیل کی کمزوری معلوم ہو جاتی تو وہ ضرور اپنے قول سے رجوع کر لیتا اور قوی تر دلیل کی پیروی کرتا اور اسی وجہ سے جہاں مشائخ نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے، محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ: "امام صاحبؒ کے قول سے اعراض صرف ان کی دلیل کی کمزوری کی صورت میں کیا جا سکتا ہے" (کیونکہ دلیل کی کمزوری کی صورت میں خود امام صاحبؒ اپنی رائے کو چھوڑ دیتے اس لیے ہم بھی چھوڑ سکتے ہیں)

مذہب کے دائرہ میں رہنا ضروری ہے:

اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ مذکورہ بات کو اس شرط کے ساتھ مقید کیا جانا چاہیے کہ وہ حدیث مسلک کے کسی قول کے موافق ہو (تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے) کیونکہ علماء نے ایسے اجتہاد کی اجازت نہیں دی ہے کہ جس سے ہمارے ائمہ کے متفق علیہ مذہب سے بالکلیہ خروج لازم آتا ہو۔ اس لیے کہ ائمہ کے اجتہاد اس کے اجتہاد سے قوی تر ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ ائمہ کے علم میں اس کی دلیل سے راجح تر کوئی دلیل ضرور آئی ہوگی جس کی بنا پر ان حضرات نے اس شخص کی دلیل پر عمل نہیں کیا۔

اور اسی شرط کی وجہ سے علامہ قاسم (۱۰) نے اپنے استاذ خاتم المحققین کمال ابن الہمام (۳۹) کے بارے میں فرمایا ہے کہ: "ہمارے استاذ کی ان تحقیقات پر عمل نہیں کیا جائے گا

جو مذہب کے خلاف ہیں۔'' اور علامہ قاسمؒ نے اپنی کتاب التصحیح والترجیح علی القدوری میں فرمایا ہے کہ امام علامہ حسن بن منصور بن محمود اوز جندی رحمہ اللہ جن کی شہرت بنام قاضی خان (۲۲) ہے اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''(ضوابط افتاء) ہمارے زمانہ میں حنفی مفتی سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے اور کسی واقعہ کے بارے میں پوچھا جائے تو اگر وہ مسئلہ ہمارے ائمہ سے ظاہر روایت میں بلا اختلاف مروی ہے تو وہ ان کے قول کی طرف مائل ہو اور ان کے قول کے مطابق فتویٰ دے۔ اور ان کے خلاف اپنی رائے نہ چلائے' اگر چہ وہ ماہر مفتی ہو کیونکہ حق بظاہر ہمارے ائمہ کے ساتھ ہوگا۔ ان سے متجاوز نہ ہوگا اور اس مفتی کا اجتہاد ائمہ کے اجتہاد کو نہیں پہنچ سکتا اور ان لوگوں کے قول کی طرف التفات نہ کرے جو ائمہ کے خلاف کہتے ہیں نہ اس کی دلیل قبول کرے کیونکہ تمام دلائل ہمارے ائمہ کے علم میں آ چکے ہیں اور انہوں نے صحیح ثابت اور اس کے برعکس کے درمیان امتیاز کر لیا ہے الخ (قاضی بز عالم گیری ج ا ص ۲)

پھر علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اسی قسم کی بات امام خصاف رحمہ اللہ (۱۶) کی ادب القضاء کی برہان الائمہ (۶۸) کی شرح سے بھی نقل کی ہے۔[1]

وہ مسائل جو توسعاً مذہب میں شامل ہیں:

میں کہتا ہوں مگر کبھی فقہاء ہمارے ائمہ کے متفقہ مسائل سے کسی ضرورت وغیرہ کی وجہ سے عدول کرتے ہیں۔ یہ بات پہلے آ چکی ہے جہاں تعلیم قرآن اور اس قسم کی دوسری طاعتوں پر اجارہ کے جواز کا مسئلہ آیا ہے جن طاعات میں اجارہ کے عدم جواز سے دین کی بربادی کا اندیشہ

---

[1] مسلک کے دائرہ میں رہنے کی شرط فقہائے احناف کے علاوہ دیگر مکاتیب فکر کے فقہاء نے بھی لگائی ہے مگر اس شرط کے ساتھ ائمہ کے قول اذا صح الحدیث فھو منھبی کا کچھ مفاد باقی نہیں رہتا۔ کچھ لوگ اس قول کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر امام کے قول کے خلاف صحیح حدیث آ جائے تو امام کا قول چھوڑ دیا جائے مگر الفاظ اس مطلب کی بھی تائید نہیں کرتے۔ اس قول کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو مسائل امام کے مسلک میں مسکوت عنہ ہیں یعنی امام سے اس بارے میں کچھ مروی نہیں ہے۔ اگر ان کے بارے میں صحیح حدیث آ جائے تو وہ امام کا مسلک شمار ہوں گے اور امام کی فقہ میں ان مسائل کا اضافہ کر دیا جائے گا کیونکہ اگر امام بقید حیات ہوتے اور ان کے سامنے وہ حدیث آتی تو وہ ضرور اسے لیتے اور اس کے مطابق قول کرتے اور اپنی فقہ میں اس کو شامل کرتے۔ ۱۲

ہے جس کی پوری تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں پس ایسے احوال میں ائمہ کے قول کے خلاف فتویٰ دینا درست ہے' یہ بات ہم عنقریب الحاوی القدسی (۹۲) کے حوالہ[1] سے بیان کریں گے اور اس کی مزید تفصیل اس کتاب کے آخر میں آئے گی جہاں ہم عرف[2] و عادت پر گفتگو کریں گے۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) جن مسائل میں امام اعظمؒ کے تلامذہ نے امام صاحبؒ کی مخالفت کی ہے' اگر بعد کے معتبر مشائخ نے تلامذہ کے ان اقوال کو ترجیح دی ہے تو وہ اقوال امام صاحب کے مذہب سے خارج نہ ہوں گے (جیسے صاحبین مزارعت کو جائز کہتے ہیں اور بعد کے فقہاء نے اسی قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے)

(۲) اسی طرح وہ مسائل جن کا مشائخ نے زمانہ بدل جانے کی وجہ سے یا ضرورت وغیرہ کی وجہ سے جدید عرف پر مدار رکھا ہے وہ بھی امام صاحب کے مذہب سے خارج نہ ہوں گے۔ کیونکہ مشائخ نے جس بات کو اپنے خیال میں اس کی دلیل کے راجح ہونے کی وجہ سے ترجیح دی ہے' ان کو ایسا کرنے کی امام صاحب نے اجازت دی ہے (جیسے ان طاعات مقصودہ پر اجارہ کے جواز کا مسئلہ جن میں اجارہ کے عدم جواز سے دین میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ متاخرین کا یہ فیصلہ اصل مذہب کے خلاف ہے۔ تاہم وہ فقہ حنفی میں شامل ہے)

(۳) اسی طرح مشائخ نے جن مسائل کا بدلے ہوئے زمانے پر اور ضرورت پر مدار رکھا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر امام صاحب زندہ ہوتے تو وہ بھی وہی بات فرماتے جو ان مشائخ نے کہی ہے کیونکہ مشائخ نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی امام صاحبؒ ہی کے اصولوں پر مبنی ہے اس لیے وہ بھی امام صاحبؒ کے مذہب کا مقتضی ہے (یہ مذہب میں مسکوت عنہ مسائل ہیں جن کے احکام بعد کے مشائخ نے مرتب کئے ہیں اور ایسے مسائل بے شمار ہیں۔ حوادث الفتاویٰ یعنی ہر دور میں جدید پیش آنے والے مسائل بھی اسی قسم میں داخل ہیں۔)

مستزاد مسائل کے لیے مناسب تعبیر:

مگر اس قسم کے بڑھائے ہوئے مسائل میں قال ابوحنیفۃ کذا (امام صاحب نے یہ فرمایا

---

[1] اشعار نمبر ۲۶ تا ۲۹ کی شرح میں حاوی قدسی کی عبارت آرہی ہے۔

[2] شعر نمبر ۲۹ کی شرح میں تفصیل آئے گی۔

ہے) کہنا مناسب نہیں۔ یہ تعبیر صرف ان مسائل میں ہونی چاہیے جو امام صاحبؒ سے صراحۃً مروی ہیں۔ مستزاد مسائل کی تعبیر مقتضیٰ مذہب ابی حنیفہ کذا (امام صاحب کے مذہب کا مقتضیٰ یہ ہے) ہونی چاہیے اور اس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں کہ یہ مستزاد مسائل امام صاحب کے مذہب کا مقتضیٰ کیسے ہیں۔ اور یہی تعبیر ان مسائل میں بھی ہونی چاہیے۔ جن کی مشائخ نے امام صاحب کے قواعد وضوابط پر تخریج کی ہے یا امام صاحبؒ کے کسی قول پر قیاس کر کے بات کہی ہے اور جس کے لیے یہ تعبیر بھی آتی ہے کہ علی قیاس قولہ بکذا یکون کذا (یعنی امام صاحب کے فلاں قول کے انداز پر اس مسئلہ کا یہ حکم ہے)

غرض ان سب صورتوں میں قال ابو حنیفہ نہیں کہا جائے گا۔ ہاں ان سب کو امام صاحبؒ کا مذہب کہہ سکتے ہیں بایں معنی کہ وہ امام صاحب کے متبعین کے اقوال ہیں یا امام صاحبؒ کے مذہب کا مقتضیٰ ہیں۔

اقوال تلامذہ کے اقوال امام ہونے کی ایک دلیل:

اور اسی وجہ سے کہ تلامذہ کے اقوال بھی امام صاحب کے اقوال ہیں۔ الدرر والغرر کے مصنف ملا خسرو رحمہ اللہ (۴۵) نے جب کتاب القضاء میں یہ مسئلہ بیان کیا کہ ''جب قاضی کسی مختلف فیہ مسئلہ میں امام صاحب کے مذہب کے خلاف فیصلہ کرے تو وہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا'' تو شرح میں اس کی وضاحت اس طرح کی:

> ''یعنی قاضی اصل مذہب کے خلاف فیصلہ کرے مثلاً حنفی قاضی امام شافعی یا ان جیسے کسی اور مجتہد کے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے یا اس کے برعکس یعنی شافعی قاضی مذہب حنفی کے مطابق فیصلہ کرے (تو وہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا) لیکن اگر حنفی قاضی امام ابو یوسف یا امام محمدؒ یا ان جیسے امام اعظم کے دیگر تلامذہ کے اقوال پر فیصلہ کرے تو اس کو امام اعظم کی رائے کے خلاف فیصلہ نہیں کہا جائے گا۔''

(درر الحکام ج ۲ ص ۴۰۹)

تخریجی مسائل، اقوال تلامذہ کی بہ نسبت مذہب سے قریب تر ہیں:

اور ظاہر یہ ہے کہ جن مسائل کی امام اعظم رحمہ اللہ کے قول پر تخریج کی گئی ہے ان کی امام اعظم کی طرف نسبت ان اقوال کی بہ نسبت قریب تر ہے جن کے قائل امام ابو یوسف یا امام محمد

ہیں کیونکہ وہ تخریجی مسائل امام صاحب کے اصول وقواعد پر مبنی ہوتے ہیں اور جن مسائل کے امام ابو یوسف وغیرہ امام اعظم کے تلامذہ قائل ہیں' ان میں سے بہت سے مسائل ان کے اپنے اصول وقواعد پر مبنی ہوتے ہیں' جو قواعد امام کے برخلاف ہوتے ہیں. کیونکہ ان حضرات نے امام اعظم کے تمام قواعد کا التزام نہیں کیا ہے۔ یہ بات ہر وہ شخص بخوبی جانتا ہے جو اصول فقہ کی کتابوں سے واقف ہے۔

شبہ:

ہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب تلامذہ کے اقوال امام صاحب کی روایت ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے تو تلامذہ کے یہ قواعد بھی امام صاحبؒ کے قواعد ہوں گے کیوں کہ وہ اقوال انہیں قواعد پر مبنی ہیں پھر تخریجی اقوال مذہب سے قریب تر کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب:

بایں ہمہ تخریجات کی نسبت مذہب سے قریب تر ہے کیوں کہ وہ تخریجی مسائل امام اعظم رحمہ اللہ کے ان قواعد پر مبنی ہیں جن کو امام صاحب نے راجح قرار دیا ہے اور جن پر اپنے اقوال کا مدار رکھا ہے (یعنی تخریجی مسائل امام صاحب کے ترجیحی ضوابط پر مبنی ہیں اور تلامذہ کے اقوال جن ضوابط پر مبنی ہیں وہ امام صاحب کے متروکہ ضوابط ہیں۔

غرض جب قاضی صحیح ثابت تخریجات پر فیصلہ کرے گا تو وہ نافذ ہو جائے گا جیسا کہ تلامذہ کے اقوال میں سے صحیح اقوال پر کیا ہوا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔

یہ وہ باتیں تھیں جن کی وضاحت مذکورہ اشعار کے ذیل میں بہ توفیق الٰہی مجھے مناسب معلوم ہوئی اور اللہ تعالیٰ ہی درست بات کو بہتر جانتے ہیں اور وہی مرجع ومنتہی ہیں۔

۲۶- وَحَيْثُ لَمْ يُوْجَدْ لَهُ اخْتِيَارٌ   فَقَوْلُ يَعْقُوْبَ هُوَالْمُخْتَارُ

۲۷- ثُمَّ مُحَمَّدٍ، فَقَوْلُهُ الْحَسَنُ   ثُمَّ زُفَرَ، وَابْنِ زِيَادِ الْحَسَنُ

۲۸- وَقِيْلَ بِالتَّخْيِيْرِ فِيْ فَتْوَاهُ   اِنْ خَالَفَ الْاِمَامَ صَاحِبَاهُ

۲۹- وَقِيْلَ مَنْ دَلِيْلُهُ اَقْوىٰ رُجِحْ   وَذَا لِمُفْتٍ ذِىْ اجْتِهَادِ الْاَصَحْ

ترجمہ: (۲۶) اور جہاں امام اعظمؒ نے کوئی قول اختیار نہ کیا ہو (یعنی کسی مسئلہ میں ان کا کوئی قول موجود نہ ہو)۔ تو امام ابو یوسف ہی کا قول مختار ہے۔

(۲۷) پھر امام محمد ہی کا قول پسندیدہ ہے۔ پھر امام زفر اور حسن بن زیاد رحمہما اللہ کے اقوال مختار ہیں۔

(۲۸) اور کہا گیا کہ مفتی کو فتویٰ دینے میں اختیار ہے۔ اگر صاحبین امام صاحب کے خلاف ہوں۔

(۲۹) اور کہا گیا کہ جس کی دلیل قوی تر ہو اس کے قول کو ترجیح دی جائے گی۔ اور یہ بات مجتہد مفتی کے حق میں زیادہ صحیح ہے۔

مختلف فیہ مسائل میں کس کے قول پر فتویٰ دیا جائے؟

ابھی جو باتیں ہم نے بیان کی ہیں ان سے آپ نے یہ بات جان لی ہوگی کہ جس مسئلہ میں ہمارے ائمہ متفق ہوں ان میں کسی مجتہد فی المذہب کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے سے ان ائمہ کی متفقہ رائے سے عدول کرے کیونکہ ان کی رائے اس کی رائے سے زیادہ صحیح ہے۔ اب میں نے ان اشعار میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جب ائمہ میں اختلاف ہو تو اس قول کو مقدم کیا جائے گا جس کو امام اعظمؒ نے پسند کیا ہے خواہ تلامذہ میں سے کسی نے آپ کی موافقت کی ہو یا نہ کی ہو اور اگر امام اعظم کا کوئی قول موجود نہ ہو تو اس قول کو مقدم کیا جائے گا جس کو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے۔

فائدہ:

اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اسم گرامی یعقوب ہے آپ امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد ہیں۔ اور امام محمد رحمہ اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ امام ابو یوسفؒ کا تذکرہ کنیت کے ساتھ کیا کرتے تھے مگر جب ان کا تذکرہ ان کے استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ کرتے تو نام ذکر کرتے اور اس طرح کہا کرتے **یعقوب عن ابی حنیفة** (یعقوب روایت کرتے ہیں امام ابوحنیفہؒ سے) اور اس بات کی تاکید ان کو خود امام ابو یوسف نے کی تھی تاکہ استاذ کا ادب ملحوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ سب ہی حضرات پر مہربانی فرمائیں اور ہم پر بھی ان کی برکت سے رحم فرمائیں اور ان کا نفع تا قیامت قائم و دائم رکھیں۔ (آمین) (تمت الفائدہ)

اور جہاں امام ابو یوسفؒ کا بھی کوئی قول موجود نہ ہو تو امام محمد رحمہ اللہ کا قول مقدم کیا جائے گا جو امام ابو یوسفؒ کے بعد امام اعظمؒ کے سب سے بڑے شاگرد ہیں۔ پھر ان کے بعد

امام زفر (٧٨) اور امام حسن بن زیادہ (٧) کے اقوال دوسرے تلامذہ کے اقوال پر مقدم کیے جائیں گے۔ ان دونوں حضرات کے اقوال ایک ہی درجہ میں ہیں مگر النہر الفائق (٣٤) میں ثم بقول الحسن ہے یعنی حضرت حسن کا درجہ امام زفر کے بعد ہے۔

اور اگر مسئلہ مختلف فیہ ہو ایک طرف تنہا امام صاحب ہوں اور دوسری طرف تلامذہ ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ مفتی کو اختیار ہے جس کے قول پر چاہے فتویٰ دے اور دوسری رائے یہ ہے کہ صرف مجتہد مفتی کو اختیار ہے وہ اس قول کو اختیار کرے گا جس کی دلیل زیادہ قوی ہو۔

تائیدات:

(١) فتاویٰ سراجیہ (٩٧) میں کہا ہے۔

''پھر فتویٰ مطلقاً امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہے (خواہ ان کے ساتھ ان کا کوئی شاگرد ہو یا نہ ہو) پھر امام ابو یوسفؒ کے قول پر' پھر امام محمدؒ کے قول پر' پھر امام زفر اور حسن بن زیاد کے قول پر' اور کہا گیا ہے کہ اگر امام ابوحنیفہؒ ایک طرف ہوں اور صاحبین دوسری طرف تو مفتی کو اختیار ہوگا اور پہلا قول اس صورت میں زیادہ صحیح ہے جب مفتی مجتہد نہ ہو'' (فتاویٰ سراجیہ علی ہامش الخانیہ ص٤٨١ کتاب ادب المفتی والتنبیہ علی الجواب)

(٢) تنویر الابصار کتاب القضاء کے شروع میں بھی ایسا ہی مضمون ہے (دیکھئے شامی ج ٤ ص٣٣٦) (٣) اور الحاوی القدسی (٩٢) کے آخر میں کہا ہے کہ:

''جب کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی کوئی روایت موجود نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے ظاہر قول کو لیا جائے گا' پھر امام محمدؒ کے ظاہر قول کو' پھر امام زفر اور حسن وغیرہ' امام صاحب کے تمام بڑے تلامذہ کے اقوال کو درجہ بہ درجہ لیا جائے گا۔''

اور مذکورہ عبارت سے پہلے کہا ہے کہ:

''جب صاحبین کا قول امام صاحب کے موافق ہو تو اس سے تجاوز نہیں کیا جائے گا مگر جہاں ضرورت پیش آئے اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ اگر امام ابوحنیفہؒ وہ احوال دیکھتے جو بعد کے مشائخ کے سامنے آئے ہیں تو امام صاحب بھی ضرور یہی فتویٰ دیتے (پس ایسی صورت میں ائمہ ثلاثہ کے متفقہ فیصلہ سے بھی عدول کیا جا

سکتا ہے) اسی طرح اگر صاحبین میں سے کوئی ایک امام صاحب کے ساتھ ہو (تو بھی یہی حکم ہے کہ بے ضرورت اس سے عدول نہیں کیا جائے گا) اور اگر صاحبین دونوں ہی بظاہر امام صاحب کے خلاف ہوں تو بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کو لیا جائے گا اور بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ مفتی کو اختیار ہوگا' چاہے تو امام صاحب کے قول پر فتویٰ دے اور چاہے تو صاحبین کے قول کے مطابق فتویٰ دے اور اصح یہ ہے کہ دلیل کی قوت کا اعتبار ہے' اھ

<u>ماحصل: اور خلاصہ یہ ہے کہ:</u>

(۱) جب امام صاحب اور صاحبین کسی حکم پر متفق ہوں تو اس سے بغیر کسی مجبوری کے عدول جائز نہیں۔

(۲) اسی طرح بے ضرورت عدول جائز نہیں جبکہ صاحبین میں سے کوئی ایک امام صاحب کے موافق ہو۔

(۳) اور جب امام صاحب کسی حکم میں صاحبین سے متفرد ہوں اور صاحبین دونوں ہی امام صاحب سے اس حکم میں اختلاف رکھتے ہوں تو۔

(الف) اگر صاحبین میں سے بھی ہر ایک کسی حکم کے ساتھ متفرد ہے بایں طور کہ وہ دونوں حضرات بھی کسی ایک حکم پر متفق نہیں ہیں تو اس صورت میں بھی بظاہر امام صاحب ہی کے قول کو ترجیح ہوگی۔

(ب) اور رہی وہ صورت جبکہ صاحبین امام صاحب کے خلاف ہوں اور وہ دونوں کسی ایک حکم پر متفق ہوں اور صورت حال یہ ہوگئی ہو کہ ایک طرف امام صاحب ہوں اور دوسری طرف صاحبین تو کہا گیا کہ امام صاحب کے قول کو ترجیح دی جائے گی اور یہ امام عبداللہ بن المبارک (۹۸) کا قول ہے اور کہا گیا کہ مفتی کو اختیار ہوگا اور فتاویٰ سراجیہ (۹۷) کے قول **وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ اِذَا لَمْ يَكُنِ الْمُفْتِيْ مُجْتَهِداً** کے مفہوم مخالف سے دوسرے قول کی یعنی تخییر والے قول کی ترجیح سمجھ میں آتی ہے۔ اس صورت میں جب کہ مفتی مجتہد ہو۔

<u>فائدہ:</u>

اور اختیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد مفتی دلیل میں غور و فکر کرے اور جو کچھ اس کی

سمجھ میں آئے اس پر فتویٰ دے اس پر متعین طور پر امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا ضروری نہیں ہے (تمت الفائدہ)

اور اسی قول کی حاوی (۹۲) میں بھی وَالْاَصَحُّ اِنَّ الْعِبْرَةَ لِقُوَّةِ الدَّلِیْل کہہ کر تصحیح کی گئی ہے کیونکہ دلیل کی قوت کا لحاظ کرنا مجتہد مفتی ہی کے شایان شان ہے۔ پس جس صورت میں صاحبین امام صاحب کے خلاف ہوں تین قول ہو گئے۔

پہلا قول: بغیر اختیار کے امام صاحب کے قول کی پیروی کرنا۔

دوسرا قول: ہر مفتی کو اختیار ہونا کہ جس قول پر چاہے فتویٰ دے۔

تیسرا قول: اور وہی زیادہ صحیح ہے کہ مجتہد مفتی اور غیر مجتہد مفتی کے درمیان فرق ہے۔ قاضی خان کی بھی یہی پختہ رائے ہے جیسا کہ ابھی آ رہا ہے اور یہ تیسرا قول بظاہر پہلے دو قولوں میں تطبیق بھی ہے۔ اس طرح کہ امام صاحب کی پیروی والے قول کو غیر مجتہد مفتی پر محمول کیا جائے اور تخییر والے قول کو مجتہد مفتی پر محمول کیا جائے۔

نوٹ: اور وہ ضابطہ جو بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں امام صاحب کا کوئی صریح قول موجود نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے قول کو مقدم کیا جائے گا پھر امام محمدؒ کے قول کو الیٰ آخرہ یہ ضابطہ بظاہر غیر مجتہد مفتی کے لیے ہے اور مجتہد مفتی اس صورت میں اس قول کو اختیار کرے گا جس کی دلیل راجح ہو جیسا کہ اس نے مذکورہ بالا مسئلہ میں کیا تھا۔

صورت دوم کی مزید تفصیل:

اور مذکورہ بالا گفتگو سے معلوم ہوا کہ جب صاحبین میں سے کوئی امام صاحب کے ساتھ ہو تو بغیر اختلاف کے امام صاحب کا قول لیا جائے گا۔ اور اسی وجہ سے قاضی خان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ:

> ''اگر مسئلہ ہمارے ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہو۔ پس اگر صاحبین میں سے کوئی ایک امام صاحبؒ کے ساتھ ہو تو ان دونوں کا قول لیا جائے گا یعنی امام صاحب کا اور صاحبین میں سے ان صاحب کا جو امام صاحب کے موافق ہیں شرائط وافر ہونے کی وجہ سے اور ان کے قول میں دلائل صحت اکٹھا ہونے کی وجہ سے۔ اور اگر صاحبین دونوں ہی امام صاحب کے خلاف ہوں تو اگر ان کا اختلاف عصر و زمان

کا اختلاف ہے جیسے گواہوں کی ظاہری عدالت پر قاضی کا فیصلہ کرنا تو مفتی صاحبین کا قول لے گا' لوگوں کے احوال میں تغیر رونما ہونے کی وجہ سے اور مزارعت اور مساقات وغیرہ مسائل میں صاحبین کا قول اختیار کرے گا اس قول پر متاخرین کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے اور دیگر مسائل میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مجتہد مفتی کو اختیار ہو گا وہ اس قول پر فتویٰ دے گا جو اس کی رائے میں راجح ہو اور حضرت ابن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قول لے گا (فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج ۱ ص ۳)

صورت دوم کے حکم پر اعتراض:

میں کہتا ہوں: مگر ہم پہلے یہ بات بیان کر آئے ہیں کہ امام صاحبؒ سے جو قول منقول ہے کہ ''اذا صح الحدیث فہو مذہبی'' وہ اس صورت پر محمول ہے کہ مذہب سے بالکلیہ خروج لازم نہ آئے' جیسا کہ سابقہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے اور اس بات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دلیل (حدیث) کی پیروی کی جا سکتی ہے اگر چہ وہ مدلل قول اس قول کے خلاف ہو جس میں امام صاحب کی صاحبین میں سے کسی ایک نے موافقت کی ہے (یعنی مذکورہ بالا صور ثلاثہ میں سے دوسری صورت میں مجتہد مفتی اگر حدیث سے تائید ہوتی ہو تو صاحبین میں سے کسی ایک کا قول لے سکتا ہے کیوں کہ اس صورت میں مذہب سے خروج لازم نہیں آتا۔ حالانکہ اوپر صورت دوم میں امام صاحب کے قول کو فتویٰ کے لیے متعین کیا گیا ہے اور مجتہد مفتی کو بھی اختیار نہیں دیا گیا)

تائیدی حوالے:

(۱) چنانچہ بحرالرائق میں فتاویٰ تاتارخانیہ (۹۹) سے نقل کیا گیا ہے کہ:

''جب امام صاحب ایک طرف ہوں اور صاحبین دوسری طرف تو مفتی کو اختیار دیا جائے گا اور اگر صاحبین میں سے کوئی ایک امام صاحب کے ساتھ ہو تو پھر ان دو کا قول لیا جائے گا مگر جب مشائخ ایک کے قول پر اتفاق کر لیں تو مشائخ کی پیروی کرے جیسا کہ فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ (۵۱) نے کئی مسائل میں امام زفر رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے (بحر ج ۶ ص ۲۶۸) فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۱ ص ۸۲) (جب مشائخ صاحبین میں سے ایک کا قول اختیار کر سکتے ہیں جو صورت ثانیہ ہے تو ثابت

ہوا کہ اس صورت میں بھی امام صاحب کا قول فتویٰ کے لیے متعین نہیں ہے)

(۲) اور علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ (۳۱) اپنے رسالہ رفع الغشاء فی وقت العصر والعشاء میں لکھتے ہیں:

''صاحبین کے قول کو یا ان میں سے کسی ایک کے قول کو امام صاحب کے قول پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ ہاں کوئی وجہ ہو تو ترجیح دی جا سکتی ہے اور وجوہ تین ہو سکتی ہیں (۱) امام صاحب کی دلیل کی کمزوری (۲) ضرورت و تعامل' مزارعت و مساقات کے مسائل میں صاحبین کے قول کی ترجیح اسی وجہ سے ہے (۳) صاحبین کا اختلاف' اختلاف عصر و زمان ہو اور یہ یقین ہو کہ اگر امام صاحب بدلے ہوئے احوال بچشم خود دیکھتے جو صاحبین کے زمانہ میں پیش آئے تو آپ ضرور صاحبین کی موافقت کرتے جیسے صاحبین کے نزدیک گواہوں کی ظاہری دینداری پر قاضی کا فیصلہ کرنا درست نہیں' تزکیہ ضروری ہے'' (رسائل ابن نجیم ص ۴۵) (اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ صاحبین میں سے کسی ایک کے قول کو بعض صورتوں میں ترجیح دی جا سکتی ہے اور یہی صورت ثانیہ ہے)

(۳) اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو محقق علامہ قاسم رحمہ اللہ (۱۰) نے اپنی کتاب التصحیح والترجیح للقدوری میں کہی ہے کہ:

''علاوہ ازیں مسلکی مجتہدین کا دور اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوا جب تک انہوں نے تمام اختلافی مسائل میں غور و فکر نہیں کر لیا اور ترجیح و تصحیح کا کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا دیا' چنانچہ ان کی تصنیفات امام ابوحنیفہؒ کے قول کی ترجیح اور اس کو اختیار کرنے کی شہادت دیتی ہیں بجز معدودے چند مسائل کے' جن میں انہوں نے صاحبین کے قول پر یا ان میں سے کسی ایک کے قول پر' اگرچہ دوسرا امام صاحب کے ساتھ ہو' فتویٰ دینے کو پسند کیا ہے جیسا کہ انہوں نے ان مسائل میں صاحبین میں سے کسی ایک کا قول اختیار کیا ہے جن میں امام صاحب سے صراحۃً کوئی قول مروی نہیں ہے۔ انہی اسباب کی وجہ سے جن کی طرف قاضی خان نے اشارہ کیا ہے بلکہ مشائخ نے سب ائمہ کے اقوال کی موجودگی میں امام زفر رحمہ اللہ

کے قول کو اختیار کیا ہے اسی قسم کے اسباب کی وجہ سے اور ان مشائخ کی ترجیحات و تصحیحات آج بھی موجود ہیں۔ پس ہمارے ذمہ راجح کی پیروی لازم ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے جیسا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں فتویٰ دیتے تو اس کی پیروی لازم ہوتی۔''

مجتہد سے مراد:

(تتمہ) علامہ بیری رحمہ اللہ (۳۱) نے فرمایا ہے کہ اجتہاد سے مراد دو اجتہادوں میں سے ایک ہے اور وہ مجتہد فی المذہب ہے اور انہوں نے مجتہد فی المذہب کی تعریف کی ہے: ''جو اپنے امام کے منصوص مسائل پر دوسری شکلیں نکالنے کی پوری طرح قدرت رکھتا ہو، یا وہ اپنے امام کے مذہب کا ماہر ہو، امام کے ایک قول کو دوسرے قول پر جس کو امام نے مطلق چھوڑا ہے ترجیح دینے کی پوری قدرت رکھتا ہو'' اس کی مزید وضاحت آگے اشعار ۳۰ تا ۳۳ کی شرح میں آئے گی۔

وضاحت: اس بحث میں جو بار بار ''مجتہد مفتی'' کا لفظ آیا ہے، اس سے مجتہد مطلق مراد نہیں ہے۔ بلکہ مجتہد مقید مراد ہے جو کسی مخصوص مسلک کے تعلق سے مجتہدانہ شان رکھتا ہو اس میں مجتہد فی المذہب مجتہد فی المسائل، اصحاب تخریج اور اصحاب تصحیح و ترجیح سب ہی شامل ہیں۔

۳۰- فَالْآنَ لَا تَرْجِيْحَ بِالدَّلِيْلِ فَلَيْسَ اِلَّا الْقَوْلُ بِالتَّفْصِيْلِ

۳۱- مَالَمْ يَكُنْ خِلَافُهُ الْمُصَحَّحَا فَنَأْخُذُ الَّذِيْ لَهُمْ قَدْ وَضَحَا

۳۲- فَاِنَّنَا نَرَاهُمُوْ قَدْ رَجَّحُوْا مَقَالَ بَعْضِ صَحْبِهٖ وَصَحَّحُوْا

۳۳- مِنْ ذَاكَ مَا قَدْ رَجَّحُوْا لِزُفَرْ مَقَالَهُ فِيْ سَبْعَةٍ وَّعَشَرْ

ترجمہ: (۳۰) پس اب دلیل سے ترجیح نہیں رہی۔ پس نہیں ہے مگر تفصیل والا قول۔

(۳۱) جب تک امام صاحب کے قول کے علاوہ قول تصحیح کیا ہوا نہ ہو۔ پس اگر ایسا ہو تو ہم اس قول کو لیں گے جو ان تصحیح کرنے والوں کے لیے واضح ہوا ہے۔

(۳۲) کیونکہ ہم اصحاب تصحیح کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ترجیح دی ہے۔ امام صاحب کے بعض تلامذہ کے اقوال کو اور تصحیح کی ہے انہوں نے (ان کے اقوال کی)

(۳۳) اس میں سے ہے وہ جو ترجیح دی ہے انہوں نے امام زفرؒ کے۔ اقوال کو سات اور دس (سترہ) مسائل میں۔

ترکیب:

لیس تامہ ہے، اِلَّا استثناء مفرغ ہے۔ لَمْ یَکُنْ میں کان تامہ ہے ای لم یُوجَدْ المصححا صفت ہے خلافہ کی اور موصوف صفت مل کر لَمْ یَکُنْ کا فاعل ہیں۔ اَلَّذِیْ صلہ کے ساتھ ناخذ کا مفعول بہ ہے۔ صححوا کا مفعول بہ محذوف ہے، مِنْ ذَاکَ خبر مقدم ہے ماقدر جحوا الخ مبتدا موخر ہے، سَبْعَۃَ عَشَرَ کے بجائے سبعۃ عشر ضرورت شعری کی وجہ سے باندھا گیا ہے۔

مفتیان زمانہ کا حکم:

آپ جان چکے ہیں کہ اصح قول یہ ہے کہ مجتہد مفتی کو اختیار ہے کہ اس قول پر فتویٰ دے گا جس کی دلیل اقویٰ ہو، اس پر اس تفصیل کی پابندی لازم نہیں جو شعر ۲۶ و ۲۷ میں گزری ہے، اور جب ہمارے زمانہ میں مجتہد مفتی باقی نہیں رہے، محض مقلد مفتی باقی رہ گئے تو ہم پر اس تفصیل کی پیروی واجب ہے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیں گے، پھر امام ابو یوسفؒ کے قول پر، پھر امام محمدؒ کے قول پر الیٰ آخرہ جب تک ہمارے سامنے یہ بات نہ آئے کہ مجتہدین فی المذہب نے اس کے برخلاف قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل کی قوت کی وجہ سے یا زمانہ کے احوال بدل جانے کی وجہ سے یا اس قسم کی کسی اور وجہ سے جو ان کے سامنے ظاہر ہوئی ہو ورنہ ہم ان کی تصحیح کی پیروی کریں گے جیسا کہ اگر وہ حضرات زندہ ہوتے اور ہمیں فتویٰ دیتے تو ہم پر ان کی پابندی لازم تھی، جیسا کہ یہ بات آپ ابھی علامہ قاسم کے کلام میں پڑھ آئے ہیں کیونکہ وہ حضرات مذہب کو زیادہ جانتے تھے اور بہتر سمجھتے تھے۔

اور ان حضرات کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی تو وہ صاحبین کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور کبھی صاحبین میں سے کسی ایک کے قول کو اور سترہ مسائل میں تو انہوں نے امام زفر رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے جن کو علامہ بیریؒ (۳۱) نے ایک رسالہ[1] میں جمع کیا ہے اور سیدی احمد حمویؒ (۳۱) کی ان مسائل کے بارے میں ایک نظم[2] ہے۔ لیکن اس نظم[3] کے بعض مسائل پر اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ وہ امام زفر کے مخصوص مسائل نہیں ہیں۔ اور میں نے بھی ان مسائل

---

[1] علامہ بیری کے ستر سے زیادہ رسائل ہیں (معجم المولفین ج ۱ ص ۲۲۔

[2] اس نظم کی علامہ عبدالغنی نابلسیؒ نے شرح لکھی ہے۔ (شامی ج ۲ ص ۷۲۵)

[3] وہ تین مسائل ہیں جن کی تفصیل شامی ج ۲ ص ۷۲۵ میں ہے۔ ۱۲

میں ایک نفیس نظم لکھی ہے' اس میں وہ مسائل نہیں لیے جو قابل اعتراض تھے اور حموی کی نظم پر میں نے چند مسائل کا اضافہ کیا ہے۔(اس نظم میں مسائل کی مجموعی تعداد بیس ہے) یہ نظم میں نے اپنے حاشیہ رد المحتار' باب النفقۃ ج ۲' ص ۷۲۶ میں ذکر کی ہے۔

اعتراض و جواب:

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ البحر الرائق' کتاب القضاء' ج ۶ ص ۲۶۹ میں تحریر فرماتے ہیں:

''پس اگر کوئی شبہ کرے کہ مشائخ کے لیے مقلد ہوتے ہوئے یہ کیسے جائز ہو گیا کہ وہ امام اعظمؒ کے علاوہ دوسرے کے قول پر فتویٰ دیں؟ تو میں کہوں گا کہ یہ اشکال خود مجھے عرصہ تک رہا ہے' میری سمجھ میں اس کا کچھ جواب نہیں آتا تھا مگر اب اکابر کے کلام سے ایک جواب میری سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ علماء نے ہمارے ائمہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ: ''کسی کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کہاں سے بات کہی ہے۔'' اور فتاویٰ سراجیہ (۹۷) میں تو یہاں تک منقول ہے کہ عصام بن یوسف (۱۰۰) جو امام اعظم کے خلاف فتویٰ دیتے تھے تو اس کا سبب یہی تھا' وہ بکثرت امام صاحب کے قول کے خلاف فتویٰ دیتے تھے کیونکہ ان کے علم میں امام صاحب کے اقوال کی دلیل نہیں ہوتی تھی اور دوسروں کے اقوال کی دلیل ان کے لیے واضح ہوتی تھی اس لیے وہ دوسروں کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔''

(جواب کا حاصل یہ ہے کہ حنفی کے لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کو امام صاحب کے قول کی دلیل معلوم ہو ورنہ دوسرے کے قول کو اختیار کرے گا پس جو مشائخ امام صاحب کے علاوہ دوسرے کے قول پر فتویٰ دیتے تھے تو اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ ان کو امام صاحب کے قول کی دلیل معلوم نہیں ہوتی تھی)۔

کیا فتویٰ دینے کے لیے مفتی بہ قول کی دلیل معلوم ہونا ضروری ہے؟

پس میں (ابن نجیم[1]) کہتا ہوں کہ یہ شرط اکابر کے زمانہ میں تھی۔ اب ہمارے زمانہ میں فتویٰ دینے کے لیے صرف مسئلہ کا اچھی طرح محفوظ ہونا کافی ہے جیسا کہ قنیہ وغیرہ میں ہے۔

---

[1] یہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی عبارت ہے ۱۲

پس امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہو کہ امام صاحب نے وہ بات کہاں سے فرمائی ہے۔ بناءعلیٰ ہذا حاوی قدسی[1] میں جس قول کو صحیح قرار دیا ہے یعنی قوت دلیل کے معتبر ہونے کا قول تو وہ اسی شرط پر مبنی ہے مگر اب علماء نے طے کر دیا ہے کہ امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا (دلیل جاننے کی شرط ختم کر دی ہے) تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ذمہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا واجب ہے۔ اگرچہ مشائخ نے امام صاحب کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہو۔ کیونکہ ان حضرات نے امام صاحب کے قول کے خلاف فتویٰ اس لیے دیا تھا کہ ان کے حق میں امام اعظم کے قول پر فتویٰ دینے کی شرط مفقود تھی اور وہ شرط ''امام صاحب کے قول کی دلیل سے واقف ہونا'' تھی، رہے ہم تو امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیں گے اگرچہ ہمیں ان کے قول کی دلیل معلوم نہ ہو۔ (کیونکہ دلیل جاننے کی شرط ہمارے لیے باقی نہیں رہی)

اور محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے متعدد مواقع میں مشائخ پر جہاں انہوں نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے، یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ امام صاحب کے قول سے عدول صرف دلیل کی کمزوری کی صورت میں کیا جا سکتا ہے (علامہ کی اس بات کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا ضروری ہے اور اگر کوئی شبہ کرے کہ علامہ نے تو دلیل کا بھی اعتبار کیا ہے کہ جب امام صاحب کی دلیل قوی ہو تو اس پر فتویٰ دینا ضروری ہے، دلیل ضعیف ہو تو اس سے عدول کیا جا سکتا ہے اس صورت میں امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا ضروری نہیں ہے تو ابن نجیم اس کا جواب دیتے ہیں) لیکن علامہ ابن الہمام دلیل میں غور وفکر کرنے کی اہلیت رکھتے تھے (اس لیے ان کے حق میں دلیل کا اعتبار ہے) اور جو لوگ دلیل میں غور وفکر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ان کے ذمہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا لازم ہے۔

<u>اہلیت نظر:</u>

اور یہاں اہلیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فقہ کو خوب جانتا ہو، فقہاء کے اقوال کے درمیان امتیاز کر سکتا ہو اور اس میں بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی پوری صلاحیت ہو۔

---

[1] حاوی کی بات سے صاحب بحر کے مدعیٰ پر اعتراض وارد ہو سکتا تھا اس لیے وہ اس عبارت کا جواب دے رہے ہیں۔۱۲

اہلیت فتویٰ:

اور کوئی شخص فتویٰ دینے کا اس وقت تک اہل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے درست جوابوں کی تعداد نادرست جوابوں سے زیادہ نہ ہوجائے کیونکہ جب درست جوابات کی تعداد زیادہ ہوگی تو وہی غالب ہوں گے۔ اور غالب کے مقابلہ میں مغلوب کا اعتبار نہیں کیا جاتا کیونکہ امور شرعیہ کا مدار اعم واغلب پر ہے جیسا کہ فتاویٰ ولوالجیہ (۹۱) کی کتاب القضاء میں ہے اور علامہ کردری (۴۱) کی کتاب مناقب الامام الاعظم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (۹۸) سے دریافت کیا گیا کہ آدمی کے لیے فتویٰ دینا اور قاضی بننا کب جائز ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ:

''جب آدمی حدیث شریف اور قیاس سے پوری طرح واقف ہوجائے اور وہ امام اعظم کے اقوال کو پوری طرح جانتا ہو اور وہ اس کو خوب محفوظ ہوں۔''

(یہاں ایک بار پھر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ امام ابن المبارک دلیل کا اعتبار کر رہے ہیں۔ وہ مفتی کے لیے حدیث و قیاس کی معرفت ضروری قرار دے رہے ہیں۔ ابن نجیم اس کا جواب دیتے ہیں) اور عبداللہ بن المبارک کا یہ قول ہمارے علماء کی دو روایتوں میں سے ایک پر محمول ہے (وہ دو روایتیں یہ ہیں (۱) فتویٰ دینے کے لیے مفتی بہ قول کی دلیل معلوم ہونا ضروری ہے (۲) ضروری نہیں ہے۔ ابن المبارک کا قول پہلی روایت پر مبنی ہے) اور مذہب کے آخری شکل اختیار کرنے سے پہلے کی بات ہے۔ اب مذہب کے مدلل ہوجانے کے بعد ان امور کی (یعنی حدیث و قیاس کو جاننے کی) کوئی حاجت نہیں۔ کیونکہ اب مفتی اور قاضی کے لیے تقلید ممکن ہے (علامہ ابن نجیم کی عبارت پوری ہوئی)۔

غیر مجتہد مفتی صرف ناقل فتاویٰ ہوتا ہے:

(ارملی کا ابن نجیم پر رد)

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ ابن نجیم کے اس کلام میں جو بے ربطی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اسی وجہ سے خیر الدین رملی رحمہ اللہ (۲۸) نے بحر کے حاشیہ مظہر الحقائق[1] میں اس عبارت پر اعتراض کیا ہے کہ ابن نجیم کا یہ فرمانا کہ: ہمارے لیے امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا واجب

---

[1] یہ حاشیہ ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اپنے بحر کے حاشیہ منحۃ الخالق (ج ۶ ص ۲۶۹) میں رملی کی عبارت نقل کی ہے۔ ۱۲

ہے اگر چہ ہم نہ جانتے ہوں کہ امام صاحب نے وہ قول کہاں سے کیا ہے'' یہ بات امام اعظم رحمہ اللہ کی اس بات کے خلاف ہے کہ ''کسی کے لیے بھی جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کس دلیل سے بات کہی ہے'' کیوں کہ امام صاحب کا یہ قول صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ''غیر مجتہد کے لیے فتویٰ دینا ہی جائز نہیں'' پھر اس قول سے اس بات پر کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ''امام اعظم کے قول پر فتویٰ دینا واجب ہے''؟

(اور اگر کوئی شبہ کرے کہ آج کل تو مجتہد مفتی کا وجود نہیں تو کیا اب فتویٰ دینا ہی جائز نہیں؟ رملی اس کا جواب دیتے ہیں:)

> ''تو میں کہتا ہوں کہ غیر مجتہد جو فتویٰ دیتا ہے وہ درحقیقت فتویٰ ہی نہیں وہ تو صرف مجتہد کی بات نقل کرتا ہے کہ اس نے یہ فرمایا ہے (اور محض نقل کے لیے دلیل کا جاننا ضروری نہیں) اور اس اعتبار سے امام صاحب کے علاوہ دوسرے کا قول نقل کرنا بھی جائز ہے۔ پھر ہمارے ذمہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینا۔ گو کہ مشائخ نے آپ کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہو۔ کیسے واجب ہو گیا؟ جب کہ ہم ان مشائخ کے فتاویٰ کے صرف ناقل ہیں (رملی کی عبارت پوری ہوئی)''

مشائخ، امام اعظم کے دلائل سے بخوبی واقف تھے:

(ارملی کے رد کی وضاحت اور مزید رد)

اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ مشائخ امام صاحب کے دلائل سے واقف تھے اور وہ جانتے تھے کہ امام صاحب نے کہاں سے قول کیا ہے۔ نیز وہ امام صاحب کے تلامذہ کے اقوال کے دلائل سے بھی واقف تھے پھر وہ تلامذہ کی دلیلوں کو امام صاحب کی دلیل پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور مشائخ کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے امام صاحب کے قول سے عدول اس وجہ سے کیا ہے کہ ان کو امام صاحبؒ کے قول کی دلیل معلوم نہیں تھی۔ کیونکہ ہم ان کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے دلائل قائم کر کے کتابیں بھر دی ہیں پھر وہ کہتے ہیں کہ فتویٰ .... مثال کے طور پر.......... امام یوسفؒ کے قول پر ہے۔

اور ہم میں جب دلائل میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور ہم تفریع[1] و تاصیل

---

[1] تفریع: فروع و جزئیات کا استنباط کرنا۔ تاصیل: اصول مقرر کرنا۔

کی شرائط حاصل کرنے میں مشائخ کے درجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں تو ہمارے ذمہ ان مشائخ کے اقوال کونقل کرنا ہے کیونکہ وہی حضرات مذہب حنفی کے وہ پیروکار ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو مذہب کو مدلل کرنے کے لیے اور اپنے اجتہاد سے اس کو سنوارنے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

تائیدات:

(۱) اور وہ بات آپ ضرور دیکھ لیں جو ہم پہلے علامہ قاسم کے حوالہ سے ذکر کر آئے ہیں کہ مسلکی مجتہدین کا دور اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک انہوں نے تمام اختلافی مسائل میں غور وخوض نہیں کر لیا اور ترجیح وتصحیح کا کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا دیا (الیٰ قولہ) پس ہمارے ذمہ راجح کی پیروی لازم ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے جیسا کہ وہ حضرات اگر اپنی زندگی میں فتویٰ دیتے تو اس کی اتباع لازم تھی۔

(۲) اور علامہ ابن الشلبی (۱۰۱) کے فتاویٰ[۱] میں ہے کہ:

''قاضی اور مفتی کے لیے امام صاحب کے قول سے عدول جائز نہیں۔ الا یہ کہ مشائخ میں سے کوئی صراحت کر دے کہ فتویٰ امام صاحب کے علاوہ کے قول پر ہے۔ غرض قاضی کے لیے کسی ایسے مسئلہ میں جس میں امام صاحب کے علاوہ کے قول کو ترجیح نہ دی گئی ہو' بلکہ مشائخ نے اس قول میں امام صاحب کی دلیل کو دوسروں کی دلیل پر ترجیح دی ہو' جائز نہیں ہے کہ امام صاحبؒ کے علاوہ کے قول پر فیصلہ کرے' اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا' ایسے فیصلہ کو توڑ دینے کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے''

حتی یعلم من این قلنا؟ کا پہلا مطلب:

پھر آپ جان لیں کہ امام اعظم کا جو ارشاد ہے کہ **لا یحل لا حدان ان یفتی بقولنا حتیٰ یعلم من این قلنا؟** (کسی کے لیے بھی ہمارے قول پر فتویٰ دینا جائز نہیں تا آنکہ وہ جان لے کہ ہم نے کہاں سے وہ قول کیا ہے؟) اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ پہلا مطلب وہ ہے جو عبارت کے ظاہری اور متبادر معنی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جب اس کے نزدیک کسی مسئلہ میں

---

[۱] آپ کے فتاویٰ کا نام مجمع الفتاویٰ ہے وہ ابھی تک مخطوط ہیں اور اس کا نسخہ بصرہ میں ہے (اعلام ج ۱ ص ۲۳۶)

اپنے امام کا مذہب ثابت ہو جائے۔ مثلاً امام اعظمؒ کے نزدیک وتر کی نماز واجب ہے تو اس کے لیے اس حکم پر فتویٰ دینا اس وقت جائز ہے جب وہ امام صاحب کے قول کی دلیل جان لے۔

مصداق خاص:

اور بلا شک وارتیاب یہ ارشاد اس تفسیر کے مطابق مجتہد مفتی کے ساتھ خاص ہوگا' مقلد محض مفتی کے لیے یہ ارشاد نہیں ہے کیونکہ تقلید کسی کا قول اس کی دلیل جانے بغیر لینے کا نام ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اس تعریف کی رو سے امام کے قول کو دلیل جان کر لینا تقلید سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ وہ تقلید نہیں ہے بلکہ دلیل سے مسئلہ اخذ کرنا ہے' مجتہد سے مسئلہ اخذ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام کے قول کی دلیل جان کر اس کو لینا اجتہاد کا نتیجہ ہے کیونکہ دلیل کی معرفت مجتہد ہی کو ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ دلیل کا جاننا یہ جاننے پر موقوف ہے کہ وہ دلیل معارض دلیل سے محفوظ ہے اور یہ بات تمام دلائل کا جائزہ لینے پر موقوف ہے اور یہ کام مجتہد ہی کر سکتا ہے۔

اور صرف یہ جاننا کہ فلاں مجتہد نے فلاں حکم فلاں دلیل سے اخذ کیا ہے محض بے فائدہ ہے۔ اس لیے ''مفتی کے لیے دلیل جاننا ضروری ہے'' کا مطلب یہ لینا ہوگا کہ وہ اس دلیل کا حال بھی جانتا ہوتا کہ اس کے لیے اس مسئلہ میں یقین کے ساتھ امام کی تقلید اور دوسروں کو اس پر فتویٰ دینا درست ہو اور یہ بات مجتہد فی المذہب مفتی ہی کے لیے ممکن ہے اور وہی درحقیقت مفتی ہے دوسرے لوگ تو ناقل فتاویٰ ہیں۔

پہلے مطلب پر اشکال:

لیکن قول امام کا مذکورہ بالا مطلب لینا بعید ہے کیونکہ یہ مجتہد فی المذہب مفتی جب اجتہاد مطلق کے درجہ تک نہیں پہنچا ہے تو اس پر اس کی تقلید لازم ہے جو اجتہاد مطلق کے درجہ تک پہنچ چکا ہے اور مقلد پر قول امام کی دلیل جاننا لازم نہیں البتہ ایک رائے کے مطابق جو معتزلہ کی ہے اپنے امام کی دلیل کا جاننا ضروری ہے۔ علامہ ابن الہمام التحریر میں لکھتے ہیں:

> ''**مسئلہ**: جو شخص مجتہد مطلق نہیں ہے اس پر تقلید لازم ہے۔ اگرچہ وہ فقہ کے بعض مسائل میں یا بعض علوم میں مثلاً علم الفرائض میں مجتہد مطلق ہو' اجتہاد میں تجزی (تقسیم) کے جواز کے قول کی بنا پر۔ اور یہی قول برحق ہے۔ لہٰذا جن

مسائل میں وہ اجتہاد پر قادر نہیں ہے دوسروں کی تقلید کرے گا اور عالم (جاننے والے) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس پر تقلید اس شرط کے ساتھ لازم ہے کہ اس کے لیے مجتہد کی دلیل کی صحت واضح ہو ورنہ عالم کے لیے اس کی تقلید جائز نہیں ہے اھ (التقریر ج ۳ ص ۳۴۴)

اور پہلا قول جمہور کا ہے اور دوسرا بعض معتزلہ کا' جیسا کہ تحریر کے شارح نے بیان کیا ہے پس امام ابن الہمام کا یہ قول کہ جو شخص مجتہد مطلق نہیں ہے اس پر تقلید لازم ہے اور تقلید کی وہ تعریف جو ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں' دونوں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دلیل کا جاننا صرف مجتہد مطلق پر ضروری ہے۔ دوسروں پر یہ بات لازم نہیں ہے۔ خواہ وہ دوسرا مجتہد فی المذہب ہی کیوں نہ ہو (خلاصہ اعتراض یہ ہے کہ جمہور کے قول کے مطابق مجتہد فی المذہب مفتی بھی عام مقلدین کی طرح ہے اس کے لیے بھی قول امام کی دلیل جاننا ضروری نہیں ہے پس امام صاحب کے قول کا پہلا مطلب درست نہیں ہے)

جواب:

لیکن التحریر کے شارح علامہ ابن امیر حاج رحمہ اللہ (۳۹) نے شافعی عالم علامہ بدر الدین زرکشی رحمہ اللہ (۱۰۲) سے نقل کیا ہے کہ:

''مجتہد فی المذہب کو آنکھ بند کر کے محض عامی کے ساتھ لاحق کرنا محل نظر ہے' خاص طور پر مذاہب اربعہ کے وسیع علم رکھنے والے متبعین کو۔ کیونکہ ان حضرات نے اپنے آپ کو عام مقلدین کے مقام پر کھڑا نہیں کیا ہے اور ان کو مجتہدین کے ساتھ لاحق کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مجتہد دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتا۔ اور دونوں درجوں کے درمیان کوئی واسطہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ حالتیں کل دو ہی ہیں۔ ابن المنیر کہتے ہیں کہ مختار یہ ہے کہ یہ حضرات مجتہد ہیں مگر انہوں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ وہ کوئی نیا مذہب شروع نہیں کریں گے......اور ان کے مجتہد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان میں اجتہاد کی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان کے اس التزام کی وجہ کہ وہ کوئی نیا مذہب شروع نہیں کریں گے یہ ہے کہ کوئی ایسا نیا مذہب شروع کرنا جس کی جملہ فروعات کے لیے ایسے اصول و قواعد ہوں جو

مقتدمین کے اصولوں سے علیحدہ ہوں تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ متقدمین نے تمام ممکن صورتوں کا احاطہ کرلیا ہے۔ ہاں وہ کسی ضابطہ میں کسی امام کی تقلید کر سکتے ہیں پھر اگر کسی خاص جزئیہ میں ان کے لیے اپنے امام کے علاوہ کسی اور امام کے قول کی صحت ظاہر ہو جائے تو اس وقت ان کے لیے اپنے امام کی تقلید جائز نہ ہوگی مگر اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے کیونکہ متقدمین کی نظر بہت وسیع تھی۔اھ'' (التقریر والتحبیر ج۳ص۳۴۵)

مگر علامہ شامی رحمہ اللہ نے منہیہ میں لکھا ہے کہ اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے تلامذہ نے بعض اصول میں اور بہت سی فروع میں امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ پس ابن المنیر کا اس کو مستبعد قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ خود علامہ ابن امیر حاج نے تحریر کی شرح میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(خلاصۂ جواب یہ ہے کہ مجتہد فی المذہب مفتی درحقیقت مجتہد مطلق ہوتا ہے اس لیے اس پر دلیل اور اس کا حال جاننا ضروری ہے مگر چونکہ اس نے نیا مذہب شروع نہ کرنے اور دوسرے مجتہد مطلق کی تقلید کرنے کا التزام کیا ہے اس لیے اس کا شمار مقلدین میں کیا جاتا ہے مگر اس کی حیثیت عام مقلدین سے ممتاز ہے)

قول امام کا دوسرا مطلب:

امام اعظم کے قول میں جو دو احتمال تھے ان میں سے دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس ارشاد کا مطلب ہے: امام کے اصولوں سے تخریج و استنباط کر کے امام کے قول کے مطابق فتویٰ دینا''(یعنی امام کا قول کس اصل پر مبنی ہے؟ یہ بات جان کر پھر اس قول پر دوسری جزئیات کو متفرع کرنا) علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ التحریر میں اور ابن امیر حاج رحمہ اللہ اس کی شرح التقریر والتحبیر میں فرماتے ہیں:

مسئلہ: غیر مجتہد مفتی، کسی مجتہد کے مذہب کے مطابق، اس کے اصول پر تخریج کر کے فتویٰ دے سکتا ہے۔ اس کے مذہب کو بعینہٖ نقل کرنے کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ مجتہد کے مبنیٰ سے واقف ہو یعنی وہ مجتہد کے احکام کے مآخذ کو جانتا ہو، ان میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مجتہد کے قواعد پر تفریع

کرنے پر قادر ہو' فرق و جمع پر اس کو پوری قدرت حاصل ہو اور اس بارے میں مباحثہ کر سکتا ہو۔ غرض اسے پوری دسترس حاصل ہو کہ وہ نئی جزئیات کے احکام جو صاحب مذہب سے مروی نہیں ہیں' امام کے اصولوں سے مستنبط کرے اور ایسا ہی شخص مجتہد فی المذہب کہلاتا ہے اور جو شخص ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔''

اور ہندی کی شرح بدیع (۹۷) میں ہے کہ:

''ہمارے اصحاب میں سے اور دوسرے حضرات میں سے بہت سے محققین کے نزدیک یہی قول مختار ہے کیونکہ ہمارے ائمہ میں سے امام ابو یوسف اور امام زفر وغیرہما سے یہ قول مروی ہے کہ کسی کے لیے بھی ہمارے قول پر فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جب تک وہ جان نہ لے کہ ہم نے کہاں سے قول کیا ہے؟''

اور بعض حضرات نے یہی بات بایں الفاظ کہی ہے کہ: ''جس کو اقوال یاد ہوں اور دلائل نہ جانتا ہو تو اس کے لیے مختلف فیہ مسائل میں فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔'' اور دوسرا قول یہ ہے کہ: ''اگر کوئی مجتہد موجود نہ ہو تو فتویٰ دینا درست ہے'' اور اس قول کو علامہ ابن الہمام نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ: ''مطلقاً فتویٰ دینا جائز ہے'' یعنی خواہ وہ مآخذ سے واقف ہو یا نہ ہو اور خواہ کوئی مجتہد موجود ہو یا نہ ہو۔ یہ قول صاحب بدیع علامہ ابن الساعاتی (۱۰۳) کا اور بہت سے علماء کا مختار ہے۔ کیونکہ وہ مفتی محض ناقل ہے اور نقل میں عالم (مجتہد) اور غیر عالم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مگر ان حضرات کی دلیل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ نقل کے سلسلہ میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف تخریج کے سلسلہ میں ہے۔ کیونکہ کسی مجتہد کے مذہب کو بعینہ نقل کرنا' قبول روایت کی شرائط مثلاً عدالت وغیرہ کے ساتھ بالاتفاق جائز ہے (دونوں کتابوں کی عبارت تلخیص کر کے پیش کی گئی ہے اور وہ یہاں پوری ہوئی۔ دیکھئے التقریر ج ۳ ص ۳۴۶۔

فوائد:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ سراج الدین ہندی رحمہ اللہ (۹۷) کی ذکر کردہ باتوں سے درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں۔

(۱) یہ بات کہ **لا یحل لا حد ان یفتی** الخ امام اعظم رحمہ اللہ کے اقوال کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان کے تلامذہ کے اقوال کی صورت حال بھی یہی ہے۔

(۲) مجتہد فی المذہب سے مراد سابق میں ذکر کردہ طبقات سبعہ میں سے تیسرے طبقہ کے لوگ ہیں (دوسرے طبقہ کے حضرات مراد نہیں ہیں کیونکہ ہندی نے امام ابو یوسف اور امام زفر وغیرہما کے قول پر بحث کی ہے اور یہ حضرات دوسرے طبقہ کے ہیں)

(۳) دوسرے طبقہ والے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے تلامذہ ہیں وہ مجتہد مطلق ہیں البتہ وہ امام اعظم کی ان کے اکثر اصول وضوابط میں تقلید کرتے ہیں اور اس تقلید کی دو بنیادیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) یا تو اس وجہ سے تقلید کرتے ہیں کہ ایک مجتہد کے لیے دوسرے مجتہد کی تقلید جائز ہے اور اس مسئلہ میں امام صاحبؒ سے دو روایتیں مروی ہیں اور جواز کی روایت کی تائید امام ابو یوسفؒ کے ایک واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب آپ نے جمعہ کی نماز پڑھ لی تو لوگوں نے آپ کو بتایا کہ حمام کے حوض میں چوہا پایا گیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ: ''ہم اہل مدینہ (امام مالکؒ) کی تقلید کرتے ہیں'' اور امام محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مجتہد مطلق اپنے سے بڑے ذی علم کی تقلید کر سکتا ہے۔

(ب) یا اس وجہ سے تقلید کرتے ہیں کہ ان کا اجتہاد اس مسئلہ میں امام اعظمؒ کے اجتہاد کے موافق ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کی بات بعض شوافع سے مروی ہے۔ مثلاً علامہ ابو بکر محمد بن علی بن اسماعیل قفال شاشی رحمہ اللہ (و ۲۹۱ھ ف ۳۶۵ھ) شیخ ابو علی حسن بن حاجب بن حمید شاشی رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۴ھ) اور قاضی حسین بن محمد مروزی[1] رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۲ھ) فرمایا کرتے تھے کہ ہم امام شافعیؒ کے مقلد نہیں ہیں بلکہ ہماری رائے ان کی رائے کے موافق ہو گئی ہے۔

اسی قسم کی بات امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ مثلاً امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے بارے میں بدرجہ اولیٰ کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان حضرات نے بہت سی جزئیات میں امام صاحبؒ کی مخالفت کی

---

[1] آپ کا مرو الروذ میں انتقال ہوا ہے (اعلام ۲ ص ۲۰۴)

ہے جو ان کے مقلد نہ ہونے کی دلیل ہے۔ مگر بایں ہمہ ان تلامذہ کے اقوال مذہب حنفی سے خارج نہ ہوں گے جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے منہیہ میں لکھا ہے کہ پھر میں نے ایک قابل اعتماد عالم کی تحریر دیکھی جو بعینہ یہ ہے کہ ابن الملقن (۱۰۴) نے طبقات الشافعیہ میں فرمایا ہے۔

فائدہ:

ابن برہان (۱۰۵) نے اوسط میں فرمایا ہے کہ ہمارے اکابر اور حنفی اکابر میں امام مزنی (۱۰۶) ابن سریج (۱۰۷) امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض ان کو مجتہد مطلق کہتے ہیں اور بعض مجتہد فی المذہب اور امام الحرمین (۱۰۸) نے فرمایا ہے کہ میرے خیال میں امام مزنی کی تمام رائیں تخریجات ہیں کیونکہ انہوں نے امام شافعیؒ کی اصول میں مخالفت نہیں کی ہے۔ ان کا معاملہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ جیسا نہیں ہے کیونکہ وہ دونوں حضرات اصول میں بھی اپنے امام کی مخالفت کرتے ہیں اور امام رافعی (۱۰۹) نے باب الوضو میں فرمایا ہے کہ امام مزنی کے تفردات مذہب شافعی میں شمار نہیں کئے جائیں گے جب کہ امام مزنی نے ان جزئیات کی تخریج امام شافعی کے ضوابط پر نہ کی ہو (منہیہ تمام ہوا)۔

خلاصہ کلام:

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ بات منقح ہوئی کہ امام اعظمؒ اور ان کے تلامذہ کا یہ قول کہ لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يُفْتِيَ بِقَوْلِنَا حَتّٰى يَعْلَمَ مِنْ اَيْنَ قُلْنَا؟ کا مصداق مجتہد فی المذہب کا استنباط و تخریج کے طور پر فتویٰ دینا ہے (یعنی اس کے دو مطلبوں میں سے دوسرا مطلب صحیح ہے) جیسا کہ تحریر اور شرح بدیع کی عبارتوں سے معلوم ہوا۔

مجتہد فی المذہب کون ہے؟

اور ظاہر یہ ہے کہ طبقہ ثالثہ رابعہ اور خامسہ والے مجتہد فی المذہب ہیں اور دیگر حضرات کو نقل پر اکتفا کرنی چاہیے اور ہمارے ذمہ مابعد طبقات والے ان طبقات ثلاثہ والوں سے جو نقل کریں اس کی پیروی کرنا ہے یعنی ان کے وہ استنباطات جن کے بارے میں متقدمین سے کوئی صراحت مروی نہیں ہے اور ان کی متقدمین کے اقوال میں ترجیحات اگر چہ وہ امام صاحب کے علاوہ کے قول کو ترجیح دیں۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں مفصل بیان کر آئے ہیں۔ کیونکہ

ان حضرات نے جس قول کو بھی ترجیح دی ہے محض اٹکل سے ترجیح نہیں دی ہے بلکہ ان کے مآخذ سے واقف ہونے کے بعد ہی ترجیح دی ہے' جیسا کہ ان کی تصنیفات اس بات پر شاہد ہیں۔ یہ بات علامہ ابن نجیم کی اس رائے کے خلاف ہے جو انہوں نے البحر الرائق ج ٦ ص ٢٧٠ میں بیان کی ہے۔

امام ابن الہمام کا مرتبہ:

(تنبیہ) بحر کی عبارت صریح ہے کہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ اصحاب ترجیح میں سے ہیں۔ کیونکہ ابن نجیم نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ:

هُوَ اَهْلٌ لِلنَّظْرِ فِی الدَّلِيْلِ. (بحر ج٦ ص ٢٧٠)

وہ دلیل میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پس ہم ان روایات یا اقوال میں ان کی پیروی کر سکتے ہیں جن کو وہ مدلل کرتے ہیں یا ترجیح دیتے ہیں بشرطیکہ وہ مذہب کے دائرہ سے نہ نکلیں۔ کیونکہ ان کی کچھ رائیں ایسی بھی ہیں جن میں انہوں نے مذہب کی مخالفت کی ہے۔ ان میں ان کی پیروی نہیں کی جائے گی' جیسا کہ یہ بات ان کے شاگرد علامہ قاسم رحمہ اللہ نے کہی ہے۔

اوران میں یہ صلاحیت کیسے نہیں ہوسکتی' ان کے بارے میں تو ان کے ایک معاصر برہان انباسی نے یہ فرمایا ہے کہ:

لَوْ طَلَبْتُ حُجَجَ الدِّيْنِ مَا كَانَ فِیْ بَلْد نَامَن يَقُوْمُ بِهَا غَيْرُهُ.

اگر میں دین کے دلائل جاننا چاہوں تو ہمارے شہر میں.... ابن الہمام کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جوان کو پیش کر سکے۔

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں بلکہ علامہ محقق شیخ الاسلام علی مقدسی رحمہ اللہ (١١٠) نے منظوم کنز کی شرح میں باب نکاح الرقیق میں صراحت کی ہے کہ ابن الہمام اجتہاد کے مرتبہ تک پہنچے ہوئے ہیں[1]

علامہ قاسم کا مقام:

اوراسی طرح خود علامہ قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ (١٠) شہ سواروں کے اسی دستہ کا ایک فرد

---

[1] ردالمحتار ج ٢ ص ٣٨٨ و ج ٣ ص ٣٧ میں بھی ابن الہمام کے بارے میں گفتگو ہے ١٢۔

ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے ایک رسالہ کے شروع میں جس کا نام **رفع الاشتباه عن مسئلة المیاه** ہے لکھا ہے کہ جب ہمارے علماء نے........ اللہ ان سب سے راضی ہو........ان لوگوں کو جن میں غور وفکر کی صلاحیت ہے تقلید محض سے روک دیا ہے' جیسا کہ شیخ امام عالم علامہ ابواسحٰق ابراہیم بن یوسف (۱۱۱) نے اس کو روایت کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی کے لیے بھی جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کہاں سے وہ قول کیا ہے'' تو جب یہ ممانعت میرے سامنے آئی' میں نے ائمہ کے اقوال کے مآخذ تلاش کئے اور اللہ کے فضل سے ان کی بڑی مقدار پر قابو پا لیا اور بہت سے مصنفین کی کتابوں میں جو باتیں ہیں ان کی تقلید پر میں نے قناعت نہیں کی الخ۔

اور علامہ قاسم نے ایک دوسرے رسالہ میں لکھا ہے کہ میں بفضلہٖ تعالیٰ وہی بات کہتا ہوں جو امام طحاوی رحمہ اللہ (۱۷) نے ابن حربویہ سے کہی تھی کہ **لَا یُقَلِّدُ اِلَّا عَصَبِیٌّ اَوْ غَبِیٌّ** (تقلید یا تو متعصب آدمی کرتا ہے یا غبی!)

ابن نجیم کا مقام:

اور صاحب بحر کے اس قول سے کہ **یجب علینا الافتاء بقول الامام** الخ۔ (بحر ج ۶ ص ۲۷۰) یعنی ہمارے لیے امام اعظم کے قول پر فتویٰ دینا واجب ہے۔ اس قول سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خود ابن نجیم دلیل میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ پس اگر وہ دوسرے فقہاء کی تصریح کے خلاف کسی قول کی تصحیح کریں تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا چہ جائے کہ قواعد کلیہ پر ان کی تخریجات واستنباطات کا اعتبار کیا جائے!

اور علامہ بیری رحمہ اللہ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے ابن نجیم کی الاشباہ میں جہاں یہ عبارت آئی ہے النوع الاول: معرفة القواعد الخ (ص ۱۵) یعنی پہلی نوع ان قواعد کے سلسلہ میں ہے جن کی طرف جزئیات لوٹائی جاتی ہیں اور جن پر احکام کی تفریع کی جاتی ہے اور وہ قواعد درحقیقت فقہی ضوابط ہیں۔ جن کے جاننے سے فقیہ اجتہاد کے درجہ تک ترقی کرتا ہے اگرچہ وہ اجتہاد فتویٰ میں ہو اور میں ان ضوابط کی بیشتر جزئیات جاننے میں کامیاب ہوگیا ہوں الخ جہاں یہ عبارت آئی ہے۔ وہاں علامہ بیری نے پہلے مجتہد فی المذہب کی تعریف کی ہے جو ہم ان کے

حوالہ سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ:

''اور اس عبارت میں اس طرف اشارہ ہے کہ مصنف یعنی علامہ ابن نجیم فتویٰ میں اس مرتبہ تک بلکہ اس سے کچھ اوپر تک پہنچ چکے ہیں اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل وکرم ہے کہ ان کو مخفی گوشوں سے واقف کر دیا اور وہ پوری واقفیت رکھنے والے حفاظ میں سے تھے۔''

علامہ بیریؒ کی یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس قسم کی بیش تر فروع جاننے میں علامہ ابن نجیم کی کامیابی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں دلائل میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ بحر کی ان کی اپنی عبارت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کو یہ صلاحیت حاصل نہیں تھی اور مجتہد فی المذہب کے لیے اس صلاحیت کا حصول شرط ہے اب آپ غور کر لیں۔

۳۴- ثُمَّ اِذَا لَمْ تُوْجَدِ الرِّوَايَهْ   عَنْ عُلَمَائِنَا ذَوِی الدِّرَايَهْ

۳۵- وَاخْتَلَفَ الَّذِيْنَ قَدْ تَاَخَّرُوْا   يُرَجَّحُ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ

۳۶- مِثْلُ الطَّحَاوِیْ وَاَبِیْ حَفْصِ الْكَبِيْرْ   وَاَبَوَیْ جَعْفَرٍ وَّاللَّيْثُ الشَّهِيْرْ

۳۷- وَحَيْثُ لَمْ تُوْجَدْ لِهٰؤُلَآءْ   مَقَالَةٌ وَاحْتِيْجَ لِلْاِفْتَاءْ

۳۸- فَلْيَنْظُرِ الْمُفْتِیْ بِجِدٍّ وَاجْتِهَادْ   وَلْيَخْشَ بَطْشَ رَبِّهٖ يَوْمَ الْمَعَادْ

۳۹- فَلَيْسَ يَجْسُرُ عَلَی الْاَحْكَامْ   سِوٰی شَقِیٍّ خَاسِرِ الْمَرَامْ

ترجمہ: (۳۴) پھر جب کوئی روایت موجود نہ ہو۔ ہمارے فہم وبصیرت رکھنے والے علماء سے

(۳۵) اور بعد کے فقہاء میں اختلاف ہو جائے۔ تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو اکثر کی رائے ہے۔

(۳۶) مثلاً امام طحاوی اور امام ابوحفص کبیر۔ اور ابوجعفر ہندوانی اور مشہور امام ابواللیث سمرقندی۔

(۳۷) اور جہاں نہ موجود ہو ان حضرات کا بھی۔ کوئی قول، اور فتویٰ کے لیے ضرورت پیش آئے۔

(۳۸) تو مفتی پوری کوشش اور محنت سے غور کرے۔ اور چاہیے کہ وہ قیامت کے دن کی پروردگار کی پکڑ سے ڈرے۔

(۳۹) کیونکہ احکام شرعیہ بیان کرنے پر دلیری نہیں کرتا۔ بدبخت، خائب وخاسر آدمی کے علاوہ۔

متقدمین سے روایت نہ ہو اور متاخرین میں اختلاف ہو تو کیا کیا جائے؟

الحاوی القدسی (۹۲) کے آخر میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں امام صاحب سے کوئی روایت نہ پائی جائے تو امام ابو یوسفؒ کے ظاہر قول کو لیا جائے گا۔ پھر امام محمد کے ظاہر قول کو پھر امام زفر اور حسن بن زیادہ وغیرہ امام صاحب کے تمام بڑے تلامذہ کے اقوال کو آخر تک درجہ بدرجہ لیا جائے گا۔

اور جب کسی واقعہ میں ان حضرات سے کوئی صریح جواب مروی نہ ہو اور اس مسئلہ میں بعد کے مشائخ نے کلام کیا ہو اور وہ سب حضرات کسی ایک بات پر متفق ہوں تو اس کو لیا جائے گا اور اگر ان میں اختلاف ہو تو اکثر حضرات کے اس قول کو لیا جائے گا جس پر مشہور اکابر مثلاً ابو حفص کبیر (۵۵) ابو جعفر ہندوانی (۶۱) ابو اللیث سمرقندی (۵۱) اور امام طحاوی (۱۷) وغیرہ نے اعتماد کیا ہو۔

متاخرین کا بھی کوئی قول نہ ہو تو کیا کیا جائے؟

اور اگر بعد کے مشائخ سے بھی قطعاً کوئی صریح حکم مروی نہ ہو تو مفتی اس واقعہ میں غور و فکر کرے اور اپنی پوری طاقت خرچ کرے تاکہ وہ کوئی ایسا حکم دریافت کرلے جس کے ذریعہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے اور اس مسئلہ میں اٹکل سے گفتگو نہ کرے' اپنے منصب اور اس کی ذمہ داری کا احساس کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے کیونکہ فتویٰ دینا نہایت اہم معاملہ ہے اس کی جسارت ہر جاہل' بد بخت ہی کرتا ہے۔

اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ:

> ''اگر مسئلہ غیر ظاہر الروایہ میں ہے تو اگر وہ مسئلہ ہمارے ائمہ کے اصول وضوابط کے موافق ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر کسی مسئلہ میں ہمارے ائمہ سے کوئی روایت نہ پائی جائے اور اس مسئلہ میں متاخرین کسی بات پر متفق ہوں تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر متاخرین میں اختلاف ہو تو مفتی اجتہاد کرے اور اس کے نزدیک جو بات درست ہو اس کے مطابق فتویٰ دے اور اگر مفتی مقلد ہو' مجتہد نہ ہو تو اپنی رائے میں افقہ کے قول کو لے اور جواب میں اس کا حوالہ دے اور اگر اس کے نزدیک جو افقہ ہے وہ کسی اور شہر میں ہے تو اس سے خط کے ذریعہ رابطہ قائم

کرے اور تحقیق کے بعد جواب لکھے اور اٹکل سے جواب نہ لکھ دے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی سے ڈرے'' (قاضی خان بر حاشیہ عالم گیری ج ۱ ص ۳)

فتویٰ میں صریح حوالہ ضروری ہے:

میں کہتا ہوں کہ قاضی خان رحمہ اللہ کے اس قول سے کہ: ''اگر مفتی مقلد ہو، مجتہد نہ ہو الخ'' یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ مقلد محض کے لیے ان مسائل میں جن میں کسی فقیہ سے صراحۃً حکم مروی نہیں ہے فتویٰ دینا جائز نہیں اور اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے جس کو البحر الرائق (ج ۶ ص ۲۶۸) میں فتاویٰ تاتارخانیہ (ج ۱ ص ۸۲ مقدمہ کی ساتویں فصل) سے نقل کیا ہے کہ اگر متاخرین میں اختلاف ہو تو مفتی کسی ایک کے قول کو لے اور اگر متاخرین میں سے کسی کا قول نہ پائے تو وہ خود اجتہاد کرے۔ جب کہ وہ فقہ کی وجوہ جانتا ہو اور فقہاء سے مشورہ بھی کرے اھ۔

تاتارخانیہ کا یہ قول کہ جب وہ فقہ کی جملہ تفصیلات سے واقف ہو الخ اس بات کی دلیل ہے کہ جو مفتی یہ نہیں جانتا بلکہ اس نے فقہ کی کوئی ایک کتاب یا اس کا اکثر حصہ پڑھ لیا ہے اور اس کو سمجھ لیا ہے اور اس میں کتابوں کی مراجعت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، اور مشہور قابل اعتماد کتابوں میں مسئلہ کہاں ملے گا اس کو جاننے کی اس میں استعداد پیدا ہو گئی ہے، ایسا شخص جب کوئی واقعہ کسی کتاب میں نہ پائے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے سے فتویٰ دے دے بلکہ اس کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی لاعلمی ظاہر کرے جیسا کہ اس سے بڑے مرتبہ والوں نے لاعلمی ظاہر کی ہے یعنی مجتہدین صحابہ نے اور ان کے بعد کے مجتہدین نے بلکہ اس ہستی نے جو مؤید بالوحی تھی صلی اللہ علیہ وسلم۔

صریح جزئیہ نہ ملنے کی وجہ:

اور غالب گمان یہ ہے کہ اس مفتی کا صراحت نہ پانا اس کی واقفیت کی کمی کی وجہ سے ہے یا مسئلہ مطلوبہ کے ذکر کا محل نہ جاننے کی وجہ سے ہے کیونکہ شاید ہی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے مگر اس کا کتب مذہب میں ضرور تذکرہ ہوتا ہے۔ یا تو وہ بعینہ مذکور ہوتا ہے یا کوئی ایسا قاعدہ کلیہ مذکور ہوتا ہے جو اس واقعہ کو بھی شامل ہوتا ہے۔

نظیر سے فتویٰ نہ دیا جائے:

اور کسی نظیر پر اکتفا نہ کی جائے جو واقعہ سے ملتی جلتی ہو اس لیے کہ ممکن ہے اس واقعہ اور اس نظیر کے درمیان فرق ہو جس تک اس مفتی کی نظر نہ پہنچ سکی ہو کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے درمیان اور ان کی نظیروں کے درمیان علماء نے فرق بیان کیا ہے یہاں تک کہ علماء نے اس مقصد کے لیے فروق کی کتابیں لکھی ہیں اور اگر معاملہ ہماری عقلوں کے حوالہ کیا جاتا تو ہم ان میں کوئی فرق نہ کر پاتے۔

قواعد کلیہ سے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں:

بلکہ علامہ ابن نجیمؒ نے فوائد زینیہ میں لکھا ہے کہ قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ سے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ مفتی کے ذمہ صریح حوالہ دینا ضروری ہے جیسا کہ علماء نے اس کی صراحت کی ہے اور علامہ ابن نجیم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''چاروں مذاہب میں یہ بات طے شدہ ہے کہ فقہی قواعد اکثری ہیں، کلی نہیں ہیں۔''

علامہ بیری رحمہ اللہ نے یہ بات نقل کی ہے لہٰذا جو مفتی صریح حوالہ نہ پائے اس پر لازم ہے کہ جواب دینے میں توقف کرے یا اعلم سے پوچھے اگرچہ وہ دوسرے شہر میں ہو جیسا کہ یہ بات اس عبارت سے معلوم ہو چکی ہے جو ہم فتاویٰ خانیہ کے حوالہ سے لکھ آئے ہیں۔ اور فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ اگر مفتی مجتہدین میں سے نہ ہو تو اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے مگر نقل کے طور پر، لہٰذا وہ فقہاء کے ان اقوال کو نقل کرے جو اس کو یاد ہوں۔

نظیر سے فتویٰ دینا کہاں جائز ہے؟

ہاں بعض مرتبہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کا عرف پر مدار ہوتا ہے جو نصوص شرعیہ کے مخالف نہیں ہوتے تو ان میں مفتی نظائر کے مطابق فتویٰ دے سکتا ہے جیسا کہ ہم اس کو اس نظم کے آخر میں (شعر ٦٩ کی شرح میں) ذکر کریں گے۔

٤٠- وَهٰهُنَا ضَوَابِطٌ مُحَرَّرَهْ غَدَتْ لَدٰى اَهْلِ النُّهٰى مُقَرَّرَهْ

٤١- فِيْ كُلِّ اَبْوَابِ الْعِبَادَاتِ رُجِحْ قَوْلُ الْاِمَامِ مُطْلَقًا مَالَمْ تَصِحْ

٤٢- عَنْهُ رِوَايَةٌ بِهَا الْغَيْرُ اَخَذْ مِثْلُ تَيَمُّمٍ لِمَنْ تَمْرًا نَبَذْ

٤٣- وَكُلُّ فَرْعٍ بِالْقَضَا تَعَلَّقَا قَوْلُ اَبِيْ يُوْسُفَ فِيْهِ يُنْتَقٰى

۴۴- وَفِیْ مَسَائِلِ ذَوِیْ الْاَرْحَامِ قَدْ اَفْتَوابِمَا یَقُوْلُهٗ مُحَمَّدْ

۴۵- وَرَجَّحُوْا اسْتِحْسَانَهُمْ عَلَی الْقِیَاسْ اِلَّامَسَائِلَ وَمَا فِیْهَا الْتِبَاسْ

۴۶- وَظَاهِرُ الْمَرْوِیِّ لَیْسَ یُعْدَلُ عَنْه اِلٰی خِلَافِه اِذْ یُنْقَل

۴۷- لَا یَنْبَغِی الْعُدُوْلُ عَنْ دِرَایَهْ اِذَا اَتٰی بِوِفْقِهَا رِوَایَهْ

۴۸- وَکُلُّ قَوْلٍ جَاءَ یَنْفِی الْکُفْرَا عَنْ مُسْلِمٍ وَلَوْ ضَعِیْفًا اَحْرٰی

۴۹- وَکُلُّ مَا رَجع عَنْهُ الْمُجْتَهِدْ صَارَکَمَنْسُوْخٍ فَغیرُهٗ اعْتُمِدْ

۵۰- وَکُلُّ قَوْلٍ فِی الْمُتُوْنِ اُثْبِتَا فَذَاکَ تَرْجِیْحٌ لَهٗ ضِمْنًا اَتٰی

۵۱- فَرُجِّحَتْ عَلَی الشُّرُوْحِ وَالشُّرُوْحُ عَلَی الْفَتَاوٰی الْقِدَمِ من ذَاتِ رُجُوْح

۵۲- مَالَمْ یَکُنْ سِوَاهُ لَفْظًا صُحِّحَا فَالْاَرْجَحُ الَّذِیْ بِهٖ قَدْ صُرِّحَا

ترجمہ: (۴۰) اور یہاں چند تنقیح شدہ ضوابط ہیں۔ جو عقل مندوں کے نزدیک طے شدہ ہیں۔

(۴۱) عبادات کے تمام ابواب میں ترجیح دیا گیا ہے۔ امام اعظم کا قول مطلقاً جب تک ثابت نہ ہو۔

(۴۲) امام صاحبؒ سے کوئی ایسی روایت جس کو ان کے علاوہ نے لیا ہو۔ جیسے تیمم کا حکم اس شخص کے لیے جس نے پانی میں چھوہارے ڈالے ہیں۔

(۴۳) اور ہر وہ جزئیہ جس کا قضا سے تعلق ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا قول اس میں چنا گیا ہے۔

(۴۴) اور ذوی الارحام کے مسائل میں تحقیق۔ علماء نے فتویٰ دیا ہے امام محمدؒ کے قول کے مطابق۔

(۴۵) اور علماء نے فقہاء کے استحسان کو قیاس پر ترجیح دی ہے۔ مگر چند مسائل مستثنیٰ ہیں اور ان میں کوئی اشتباہ نہیں ہے (کیونکہ وہ متعین ہیں)

(۴۶) اور ظاہر روایت سے نہیں عدول کیا جائے گا۔ اس سے اس کے خلاف کی طرف جاتے ہوئے جب نقل کی گئی ہو وہ (یعنی ظاہر روایت کے برخلاف دوسری روایت منقول بھی ہو تب بھی ظاہر روایت کو چھوڑ کر اس کو اختیار نہیں کیا جائے گا)

(۴۷) مناسب نہیں عدول کرنا درایت سے۔ جب آ جائے اس کے مطابق روایت۔

(۴۸) اور ہر وہ قول جو منقول ہو اور وہ کفر کی نفی کرتا ہو۔ کسی مسلمان سے اگر چہ وہ قول ضعیف ہو وہ زیادہ قابل قبول ہے۔

(۴۹) اور ہر وہ قول جس سے مجتہد نے رجوع کر لیا ہے۔ وہ گویا منسوخ ہو گیا ہے پس اس کے

علاوہ قول معتمد ہے۔

(۵۰) اور ہر وہ قول جس کو متون میں لیا گیا ہے۔ تو یہ اس قول کی ضمناً ترجیح ہے، جو اس کو حاصل ہوگئی ہے۔

(۵۱) پس ترجیح دی جائے گی متون کو شروح پر اور شروح کو۔ ترجیح رکھنے والے پرانے فتاویٰ پر۔

(۵۲) جب تک متون کے علاوہ قول کی صراحۃً تصحیح نہ کی گئی ہو۔ ورنہ ارجح وہ قول ہے جس کی صراحۃً تصحیح کی گئی ہے۔

میں نے ان اشعار میں (نو) ایسے قواعد جمع کیے ہیں جن کو علماء نے اپنی کتابوں میں متفرق طور پر ذکر کیا ہے اور ان قواعد کو علماء نے راجح اقوال کی علامت مقرر کیا ہے۔

(۱) عبادات میں امام اعظم کا قول مفتی بہ ہے:

پہلا قاعدہ وہ ہے جس کو برہان الدین علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ (۲۵) نے منیۃ المصلی کی شرح غنیۃ المتملی[۱] معروف بہ کبیری (ص ۲۶) میں فصل التیمم میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''امام اعظم کے کیا کہنے! کس قدر ان کی نظر باریک تھی! اور کس قدر ان کی فکر درست تھی! اور کوئی تو وجہ تھی کہ علماء نے عبادات میں مطلقاً امام اعظم رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا تجویز کیا ہے! اور جائزہ لینے سے صورت حال بھی یہی سامنے آتی ہے۔ (کہ ہر جگہ آپ ہی کے اقوال پر فتویٰ ہوتا ہے) جب تک امام صاحب سے آپ کے مخالف کے قول کے موافق کوئی روایت مروی نہ ہو، جیسے ماء مستعمل کی طہارت[۲] میں اور نبیذ تمر کے سوا پانی نہ ہونے

---

[۱] متملی کے معنی ہیں مستفید کہا جاتا ہے تملی عمرہ: طویل عمر والا ہونا اور فائدہ اٹھانا۔

[۲] ماء مستعمل کا حکم ظاہر روایت میں مذکور نہیں ہے اسی وجہ سے کافی میں جو کتب ظاہر روایت کا مجموعہ ہے صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے وضو کرنا جائز نہیں اور اس کی وضاحت نہیں کی کہ وہ پاک ہے یا ناپاک، فقہاء عراق نے بھی اس مسئلہ میں ہمارے ائمہ کے درمیان اختلاف ذکر نہیں کیا بس یہ کہا ہے کہ: ماء مستعمل ہمارے ائمہ کے نزدیک پاک ہے مگر پاک کرنے والا نہیں ہے۔''

مگر دیگر فقہاء نے اختلاف ثابت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ماء مستعمل کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں امام محمد کی روایت میں وہ پاک ہے مگر پاک کرنے والا نہیں ہے۔ امام محمدؒ نے اسی روایت کو لیا ہے

کی صورت میں صرف[1] تیمم کرنے میں۔''

(یعنی عبادات میں اگر امام اعظم کے علاوہ کسی اور کے قول پر فتویٰ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف دوسرے امام کا قول نہیں ہوتا بلکہ وہ امام صاحب کی ایک روایت بھی ہوتی ہے اس لیے وہ فتویٰ بھی امام صاحب ہی کے قول پر سمجھا جائے گا)

(۲) قضاء کے مسائل میں امام ابو یوسف کا قول مفتی بہ ہے:

دوسرا قاعدہ وہ ہے جو البحر الرائق (ج ۶، ص ۲۸۲) میں فصل الحبس سے ذرا پہلے مذکور ہے صاحب بحر فرماتے ہیں:

''اور قنیہ کے باب المفتی میں ہے کہ جن امور کا تعلق قضا سے ہے ان میں فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے، کیوں کہ ان کو قضاء کے سلسلہ میں تجربات زیادہ تھے، فتاویٰ بزازیہ کی کتاب القضا میں بھی ایسا ہی ہے۔''

لے ہے۔ امام زفر نے بھی امام ابو حنیفہؒ سے یہی روایت نقل کی ہے جیسا کہ امام قاضی خان نے اس کو اپنی شرح میں ذکر کیا ہے اور امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد کی روایت میں ناپاک ہے البتہ امام حسن امام صاحب سے نجاست غلیظہ روایت کرتے ہیں اور امام ابو یوسف نجاست خفیفہ، اور ہر شاگرد نے وہی قول لیا ہے جو اس نے روایت کیا ہے (بحر ج ا ص ۹۴) مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ماء مستعمل میں اگر امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ ہے تو وہ بھی حقیقت میں امام اعظمؒ کے قول پر فتویٰ ہے کیونکہ امام محمد رحمہ اللہ کا قول امام اعظم کی روایت ہے۔

[1] نبیذ تمر میں امام اعظم رحمہ اللہ سے تین روایتیں ہیں۔ پہلی روایت اور وہ امام صاحب کا پہلا قول ہے۔ یہ ہے کہ اس سے وضو ضروری ہے اور اس کے ساتھ تیمم ملانا مستحب ہے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ وضوء اور تیمم کو جمع کرنا واجب ہے، جیسے گدھے کے جھوٹے کا حکم ہے اس قول کو امام محمدؒ نے لیا ہے اور غایۃ البیان میں اسی کو پسند کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے اور تیسری روایت یہ ہے کہ صرف تیمم کرے، نبیذ سے وضو نہ کرے اور یہ امام صاحب کا آخری قول ہے۔ اس کی طرف امام اعظم نے رجوع کیا ہے اور یہی صحیح ہے اور یہی امام ابو یوسف، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اکثر علماء کا قول ہے اور اسی کو امام طحاویؒ نے پسند کیا ہے (بحر ج ا ص ۱۳۷)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبیذ تمر میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہے تو وہ بھی درحقیقت امام اعظم ہی کے قول پر فتویٰ ہے کیونکہ امام ابو یوسف کا جو قول ہے وہی امام صاحب کا آخری قول ہے۔ ۱۲

یعنی امام ابو یوسفؒ کو قضاء کا تجربہ ہونے کی وجہ سے زیادہ علم حاصل ہوا تھا اور اسی زیادتی علم (اور تجربہ) کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے اس قول سے کہ: ''صدقہ نفل حج سے افضل ہے۔'' اس وقت رجوع فرمالیا جب آپ نے خود حج کیا اور حج کی مشقتیں علم میں آئیں۔

اور الاشباہ کی شرح میں علامہ بیری رحمہ اللہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ شہادتوں کے سلسلہ میں بھی فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ اس اضافہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہادت قضاء کے متعلقات میں سے ہے۔

اور البحر الرائق (ج ۷، ص ۲۰۳) کتاب الدعویٰ میں ہے کہ اگر مدعیٰ علیہ خاموشی اختیار کرے (یعنی مدعی کے دعویٰ کے بارے میں نہ اقرار کرے نہ انکار کرے) تو طرفین کے نزدیک اس کو منکر قرار دیا جائے گا اور مقدمہ کی کارروائی آگے بڑھائی جائے گی) مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کو حبس میں رکھا جائے گا تا آنکہ وہ کوئی جواب دے۔ یہ بات امام سرخسیؒ نے بیان فرمائی ہے اور فتویٰ ان امور میں جن کا تعلق قضاء سے ہے امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے جیسا کہ قنیہ اور بزازیہ میں ہے اور اسی وجہ سے میں نے (علامہ ابن نجیم نے) فتویٰ دیا ہے کہ اس کو حبس میں رکھا جائے تا آنکہ وہ کوئی جواب دے۔

(۳) مسائل ذوی الارحام میں امام محمد کا قول مفتی بہ ہے:

تیسرا قاعدہ وہ ہے جو فقہ کے متن ملتقی الابحر (ج ۲ ص ۳۵۱) میں اور اس کے علاوہ دیگر کتابوں میں اس مسئلہ کے ذیل میں ہے کہ ذوی الارحام پر ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ سب حضرات فرماتے ہیں کہ **وبقول محمد یفتی** (اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا) اور علامہ علاء الدین علی بن محمد طرابلسی رحمہ اللہ (و ۹۵۰ھ ف ۱۰۳۲ھ) نے ملتقی الابحر کی کتاب الفرائض کی شرح سکب الانہر میں فرمایا ہے کہ ذوی الارحام کو وارث بنانے کے تمام مسائل میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ ہے اور ذوی الارحام کی توریث امام ابو حنیفہؒ کی دو روایتوں میں سے مشہور روایت ہے اور اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ شیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشید سجاوندی رحمہ اللہ نے بھی اپنے فرائض کی شرح[1] میں یہی فرمایا ہے اور کافی میں ہے کہ:

''اور امام محمدؒ کا قول امام ابو حنیفہؒ کی دو روایتوں میں سے مشہور روایت ہے، تمام

---

[1] یہ مضمون سراجی ص ۴۴ میں ہے خود مصنفؒ نے سراجی کی کوئی شرح نہیں لکھی ۱۲

ذوی الارحام کے سلسلہ میں' اور اسی پر فتویٰ ہے۔''

(۴) استحسان کو قیاس پر ترجیح حاصل ہے:

چوتھا قاعدہ وہ ہے جو اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ جب کسی مسئلہ میں قیاس اور استحسان جمع ہوں تو استحسان کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی البتہ چند مسائل مستثنیٰ ہیں اور وہ گیارہ ہیں جیسا کہ ناطفی (۶۷) کی اجناس میں ہے اور ان کو علامہ ابن نجیم نے بھی منار کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ پھر ذکر کیا ہے کہ نجم الدین نسفی نے ان کی تعداد بائیس تک پہنچائی ہے اور ابن نجیم نے اس سے پہلے تلویح کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ رجحان کا صحیح مطلب یہاں ''راجح (استحسان) کے مطابق عمل کا متعین ہونا اور مرجوح (قیاس) پر عمل نہ کرنا ہے۔ اور فخر الاسلام بزدوی رحمہ اللہ کے کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رجحان کے معنی اولیت کے ہیں یہاں تک کہ مرجوح (قیاس) پر بھی عمل جائز ہوگا۔

(۵) ظاہر روایت پر فتویٰ دینا ضروری ہے:

پانچواں قاعدہ وہ ہے جو البحر الرائق کی کتاب القضاء (ج ۶ ص ۲۷۰) میں ہے کہ جو اقوال ظاہر روایت سے خارج ہیں وہ مرجوع عنہ ہیں اور مرجوع عنہ قول' مجتہد کا قول باقی نہیں رہتا' علماء نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ اور ہم پہلے انفع الوسائل (۵۰) کے حوالہ سے بیان کر آئے ہیں کہ مقلد قاضی ظاہر روایت کے مطابق ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔ روایت شاذہ کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا۔ الا یہ کہ فقہاء تصریح کریں کہ فتویٰ روایت شاذہ پر ہے۔ اور البحر کے باب قضاء الفوائت (ج ۲' ص ۸۲) میں ہے کہ جب کوئی مسئلہ ظاہر روایت میں مذکور نہ ہو اور دوسری روایت میں ثابت ہو تو اس کی طرف رجوع کرنا متعین ہے۔

(۶) اختلاف روایات کے وقت درایت (دلیل) کا لحاظ:

چھٹا قاعدہ وہ ہے جو سدید الدین کاشغری رحمہ اللہ کی منیۃ المصلی کی شرح کبیری (ص ۲۹۵) میں تعدیل ارکان کی بحث میں ذکر کیا گیا ہے۔ شارح نے طمانینت قومہ اور جلسہ کے بارے میں امام اعظمؒ کی مختلف روایتیں ذکر کرنے کے بعد کہ وہ سنت ہیں یا واجب فرمایا ہے کہ:

''اور آپ جان چکے ہیں کہ دلیل کا مقتضیٰ وجوب ہے' شیخ کمال الدین ابن

الہمام نے ایسا ہی فرمایا ہے اور جب درایت کے موافق روایت بھی ہو تو اس سے عدول مناسب نہیں ہے۔''

درایت:

اور لفظ درایت (بے نقطہ دال سے) بمعنی دلیل استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ حافظ الدین نسفی کی المستصفی (۲۵) میں ہے اور اس کی تائید اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جو الحاوی القدسی کے آخر میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ سے روایتیں مختلف ہوں تو ان میں سے جو دلیل کے اعتبار سے قوی ہو اس کو لینا بہتر ہے (اس عبارت میں درایت کی جگہ حجت استعمال کیا گیا ہے، معلوم ہوا دونوں ایک ہیں)

(۷) کفر کے فتویٰ میں احتیاط لازم ہے:

ساتواں قاعدہ وہ ہے جو البحر الرائق (ج ۵ ص ۱۲۴) باب المرتد میں صدر شہید ابن مازہ (۶۸) کے فتاویٰ صغریٰ سے منقول ہے کہ:

''کفر نہایت سنگین بات ہے اس لیے میں کسی مومن کو کافر نہیں قرار دیتا جب مجھے کوئی ایسی روایت مل جاتی ہے جس سے اس کے کفر کی نفی ہوتی ہو۔''

پھر ابن نجیمؒ نے (ج ۵ ص ۱۲۵ میں) فرمایا ہے:

''اور وہ بات جو منقح ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ کسی ایسے مسلمان کی تکفیر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا جس کے کلام کو اچھے محل پر محمول کیا جا سکتا ہو یا جس کلام کے کفر ہونے میں روایتیں مختلف ہوں اگر چہ اختلاف پیدا کرنے والی روایت ضعیف ہو۔''

(۸) مرجوع عنہ قول منسوخ قول ہے:

آٹھواں قاعدہ وہ ہے جو البحر الرائق میں ہے اور اس کو ہم قریب ہی (پانچویں قاعدہ میں) بیان کر آئے ہیں کہ جس قول سے رجوع کر لیا گیا وہ مجتہد کا مذہب باقی نہیں رہا پس اس قول کو تلاش کرنا ضروری ہے جس کی طرف مجتہد نے رجوع کیا ہے اور اسی پر عمل کیا جائے گا کیونکہ پہلا قول منسوخ حکم جیسا ہو گیا ہے اور بحر ہی میں شیخ سراج الدین ہندی رحمہ اللہ (۹۷) کی ہدایہ کی شرح التوشیح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ''جس قول سے مجتہد نے رجوع کر لیا ہے اس کو لینا جائز نہیں'' اور التحریر کی شرح التقریر والتحبیر (ج ۳ ص ۳۳۴) میں مذکور ہے کہ:

''اگر بعد کا قول معلوم ہو تو وہ مجتہد کا مذہب ہوگا اور پہلا قول منسوخ ہوگا ورنہ مجتہد کے دونوں قول ان میں سے کسی کے بارے میں رجوع کا فیصلہ کیے بغیر نقل کیے جائیں گے۔''

(۹) کسی قول کا متون میں ہونا اس کی ضمنی تصحیح ہے:

نواں قاعدہ وہ ہے جو علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تصحیح القدوری میں ذکر کیا ہے کہ جو اقوال متون میں ہیں وہ التزامی طور پر تصحیح شدہ ہیں اور صریح تصحیح التزامی تصحیح پر مقدم ہے۔

میں (علامہ شامیؒ) کہتا ہوں کہ علامہ قاسم رحمہ اللہ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ متون کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں صحیح اقوال کو لینے کا التزام کیا ہے لہٰذا جو اقوال متون سے باہر ہیں جب تک ان کی صراحۃً تصحیح نہ کی جائے وہ صحیح کے مقابل ہوں گے اور صریح تصحیح کے بعد ان کو متون کے اقوال پر مقدم کیا جائے گا کیونکہ جب ان کی صراحۃً تصحیح کی گئی تو اب وہ التزامی تصحیح پر مقدم ہوں گے۔

اور فتاویٰ خیریہ کی کتاب الشہادات (ج ۲ ص ۳۳) میں ایک سوال کے جواب میں ہے کہ:

''صحیح مفتی بہ مذہب جس کو متون والوں نے لیا ہے۔ جو مذہب کی صحیح روایات یعنی ظاہر روایت کو نقل کرنے کے لیے تصنیف کئے گئے ہیں۔ یہ ہے کہ اندھے کی گواہی درست نہیں ہے۔''

متون، شروح اور فتاویٰ کی درجہ بندی:

پھر آگے (فتاویٰ خیریہ میں) لکھا ہے کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ معتبر قول حقیقت میں وہ ہے جس پر متون متفق ہوں تو وہی قول معتمد علیہ اور معمول بہ ہوگا کیونکہ علماء نے تصریح کی ہے کہ جب متون اور فتاویٰ کی باتوں میں تعارض ہو جائے تو قابل اعتماد وہ باتیں ہیں جو متون میں ہیں اسی طرح جو باتیں شروح میں ہیں ان کو فتاویٰ کے مضامین پر مقدم رکھا جائے گا اھ اور البحر الرائق کی فصل الحبس (ج ۶، ص ۲۸۵) میں ہے:

''اور عمل ان باتوں پر ہے جو متون میں ہیں اس لیے کہ جب متون اور فتاویٰ کی باتوں میں تعارض ہو جائے تو قابل اعتماد وہ باتیں ہیں جو متون میں ہیں جیسا کہ

انفع الوسائل میں ہے اسی طرح جو باتیں شروح میں ہیں ان کو فتاویٰ کی باتوں سے مقدم رکھا جائے گا۔''

اور یہ آخری بات اس وجہ سے ہے کہ انفع الوسائل میں بھی وقف کی تقسیم کے مسئلہ میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

''فتاویٰ میں منقول باتوں پر فتویٰ نہیں دیا جائے گا ان سے صرف انسیت پیدا کی جائے گی بشرطیکہ نقل مذہب کی بنیادی کتابوں میں ان کے معارض کوئی بات نہ ہو۔ اور بصورت مخالفت فتاویٰ کی طرف کوئی التفات نہ کیا جائے گا خاص طور پر اس صورت میں کہ فتاویٰ کی کتابوں میں اس کی صراحت بھی نہ ہو کہ فتویٰ اس پر ہے۔''

میں نے (علامہ شامی رحمہ اللہ نے) متاخرین کی کسی کتاب میں ہدایہ کے شارح قاضی القضات علامہ شمس الدین حریری رحمہ اللہ کی کتاب ایضاح الاستدلال علی ابطال الاستبدلال سے منقول دیکھا ہے کہ صدر الدین سلیمان نے فرمایا کہ:

''یہ فتاویٰ مشائخ کے پسندیدہ اقوال ہی ہیں، پس وہ مذہب کی کتابوں کی ٹکر میں نہیں آ سکتے۔''

اس قول کو نقل کرنے کے بعد حریری نے فرمایا ہے کہ:

''صدر الدین کے علاوہ ہمارے مشائخ میں سے اور بھی حضرات ایسا ہی فرمایا کرتے تھے اور وہی میری رائے ہے''

متون معتبرہ:

پھر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ متون سے مراد متون معتبرہ ہیں جیسے (۱) بدایۃ المبتدی (۲) مختصر القدوری (۳) المختار (۴) النقایہ (۵) الوقایہ (۶) کنز الدقائق اور (۷) ملتقی الابحر (۲۵) اس لیے کہ یہ سب مذہب کے ان اقوال کو نقل کرنے کے لیے تصنیف کیے گئے ہیں جو ظاہر الروایہ ہیں اور ملا خسرو رحمہ اللہ کا متن الغرز اور تمر تاشی غزنوی رحمہ اللہ کا متن تنویر الابصار (۲۵) اس درجہ کے متون نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں فتاویٰ کے مسائل بھی بڑی مقدار میں ہیں۔

۵۳- وَسَابِقُ الْاَقْوَالِ فِیْ الْخَانِیَۃْ وَمُلْتَقَی الْاَبْحُرِ ذُوْ مَزِیَّۃْ

۵۴- وَفِیْ سِواھُمَا اعْتُمِدَ مَا اخَّرُوْا دَلِیْلَہٗ لِاَنَّہٗ الْمُحَرَّرْ

۵۵- کَمَا ھُوَ العَادَۃُ فِیْ الْھِدایَۃْ وَنَحْوِھَا لِرَاجِحِ الدِّرَایَۃْ

۵۶- وَکَذَا اِذَا مَا وَاحِدًا قَدْ عَلَّلُوْا لَہٗ وتعلیل سِوَاہُ اھْمَلُوْا

ترجمہ: (۵۳) اور پہلے بیان کیے ہوئے اقوال فتاویٰ قاضی خان میں۔ اور ملتقی الابحر میں فضیلت رکھنے والے ہیں۔

(۵۴) اور ان کتابوں کے علاوہ میں اس قول پر اعتماد کیا گیا ہے جس کی دلیل کو ان کے مصنفین نے مؤخر بیان کیا ہے کیونکہ وہی قول منقح کیا ہوا ہے۔

(۵۵) جیسا کہ یہ ہدایہ اور اس جیسی دوسری کتابوں میں طریقہ ہے۔ دلیل کے راجح ہونے کی وجہ سے۔

(۵۶) اسی طرح جب بھی مصنفین کسی ایک قول کی دلیل بیان کریں اور اس کے علاوہ قول کو مہمل چھوڑ دیں یعنی دلیل بیان نہ کریں۔

فتاویٰ قاضی خان اور ملتقی الابحر کا طریقہ:

امام قاضی خان کے فتاویٰ میں جو اقوال سب سے پہلے ذکر کیے گئے ہیں ان کو دوسرے اقوال پر ترجیحی فضیلت حاصل ہے اس لیے کہ قاضی خان نے اپنے فتاویٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''اور جن مسائل میں متاخرین فقہاء (کے بہت سے اقوال ہیں) میں نے ان میں سے ایک یا دو قولوں پر اکتفا کی ہے اور سب سے پہلے اس قول کو ذکر کیا ہے جو اظہر ہے اور آغاز اس قول سے کیا ہے جو اشہر ہے' خواہشمندوں کی حاجت پوری کرتے ہوئے اور رغبت کرنے والوں پر آسانی کرتے ہوئے۔''

اور ملتقی الابحر کے مصنف نے بھی اسی طرح معتمد قول کو مقدم بیان کرنے کا التزام کیا ہے۔ (انہوں نے مقدمہ کتاب میں لکھا ہے قَدَّمْتُ مِنْ اقاویلھم ماھُوَ الارْجح' وَاخرتُ غیرہ ج ۱ ص ۱۰)

ہدایہ، بدائع، شروح ہدایہ وشروح کنز کا طریقہ:

اور ان دو کتابوں کے علاوہ دیگر کتابیں جن میں اقوال کو دلائل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے ہدایہ اور اس کی شرحیں اور کنز الدقائق کی شرحیں اور امام نسفی کی کافی اور بدائع الصنائع اور ان کے علاوہ دیگر مبسوط کتابیں، ان میں نقل اقوال کے وقت مصنفین کی عادت یہ رہی ہے کہ وہ امام صاحب کا قول آخر میں ذکر کرتے ہیں پھر ہر قول کی دلیل بیان کرتے ہیں پھر امام صاحب کے قول کی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ دیگر حضرات کے دلائل کے جوابات پر بھی مشتمل ہوتی ہے مصنفین کا یہ انداز بذاتِ خود امام صاحب کے قول کی ترجیح ہے الا یہ کہ وہ حضرات کسی اور کے قول کے راجح ہونے کی تصریح کریں۔

شیخ الاسلام علامہ ابن الشلبی رحمہ اللہ (۱۰۱) اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اصل یہ ہے کہ عمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔ اسی وجہ سے مشائخ عام طور پر امام صاحب کی دلیل کو ان کے تلامذہ میں سے ان کی مخالفت کرنے والوں کی دلیل پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کے مخالف نے جس دلیل سے استدلال کیا ہے اس کا جواب دیتے ہیں اور یہ بات امام صاحب کے قول پر عمل ہونے کی علامت ہے اگرچہ علماء نے اس کی تصریح نہ کی ہو کہ فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔ کیونکہ ترجیح خود صراحۃً تصحیح کی طرح ہے۔''

درمیانی قول راجح نہیں ہوتا:

اور امام نسفی رحمہ اللہ کی المستصفیٰ کے آخر میں ہے کہ:

> ''جب کسی مسئلہ میں تین قول ذکر کیے گئے ہوں تو راجح قول یا تو پہلا ہے یا آخری، درمیانی قول راجح نہیں ہے۔''

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ اس میں ایک قید کا اضافہ مناسب ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات اس صورت میں ہے جب اس کتاب کے مصنف کی عادت معلوم نہ ہو اور دلائل بھی ذکر نہ کیے گئے ہوں۔ عادت معلوم ہونے کی صورت میں......... جیسا کہ خانیہ اور ملتقی کے بارے میں گزر چکا...... عادت کی پیروی کی جائے گی۔ اسی طرح جب دلائل ذکر کیے گئے ہوں تو آخری قول کو ترجیح ہوگی جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں:

جو قول مدلل کیا گیا ہو وہی راجح ہے:

اسی طرح اگر علماء کسی مسئلہ میں دو قول ذکر کریں اور دو کا ذکر بطور مثال ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قول کی دلیل بیان کریں تو یہ اس قول کو ترجیح دینا ہے اس دوسرے قول پر جس کی دلیل نہیں بیان کی گئی۔ یہ فائدہ علامہ خیر الدین رملی رحمہ اللہ نے فتاویٰ خیریہ کی کتاب الغصب (ج ۲ ص ۱۵۰) میں بیان کیا ہے اور اس سے ملتی جلتی بات وہ ہے جو التحریر اور اس کی شرح التقریر فصل الترجیح فی المتعارضین ج ۳ ص ۲۶ میں بیان کی ہے کہ:

''وہ حکم جس کی علت سے تعرض کیا گیا ہو اس حکم سے راجح ہے جس کی علت سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ علت کا ذکر اس حکم کی اہمیت اور اس کی ترغیب پر دلالت کرتا ہے۔''

۵۷- وَحَيْثُمَا وَجدت قَوْلَيْن وَقَدْ صُحِحَ وَاحِدٌ فَذَاکَ الْمُعْتَمَدْ

۵۸- بِنَحْوِ: ذَا الفتویٰ عَلَيْهِ الْاَشْبَهُ وَالْاَظْهَر الْمُخْتَارُ ذَا وَالْاَ وُجهُ

۵۹- اَو الصَّحِيح وَالْاَصح اٰكَدْ مِنْهُ وَقِيْل: عَكْسُهُ الْمُؤَكَدْ

۶۰- كَذَابِهِ يُفْتىٰ عَلَيْهِ الْفَتْوىٰ وَذَان مِنْ جَمِيْع تِلْک اَقْوىٰ

ترجمہ: (۵۷) اور جہاں بھی آپ دو قول پائیں، اور تحقیق۔ تصحیح کیا گیا ہو ایک، تو وہی قول معتمد ہے۔

(۵۸) (تصحیح کیا گیا ہو) (۱) الفتویٰ علیہ (۲) ہذا الاشبہ (۳) ہذا الاظہر (۴) ہذا المختار اور (۵) ہذا الاوجہ جیسے الفاظ سے۔

(۵۹) یا صحیح اور اصح سے (اور وہ یعنی اصح) زیادہ مؤکد ہے۔ صحیح سے اور کہا گیا کہ اس کا برعکس مؤکد ہے۔

(۶۰) اسی طرح (تصحیح کیا گیا ہو) به يفتي اور عليه الفتویٰ سے۔ اور یہ دو لفظ ان سب الفاظ سے قوی تر ہیں۔

تصحیح مسائل کی اصطلاحات اور ان کے مراتب:

فتاویٰ خیریہ کے آخر میں (ج ۲ ص ۲۳۱) لکھا ہے کہ قدوری کی شرح جامع المضمرات والمشکلات (۱۱۲) کے شروع میں ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے علامتیں یہ ہیں:

(۱) عَلَيْهِ الْفَتْوىٰ (اسی قول پر فتویٰ ہے) (۲) به يفتي (اسی قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے)

(۳) به ناخذ (ہم اسی کو لیتے ہیں) (۴) علیه الاعتماد (یہی قول قابل اعتماد ہے)

(۵) علیه عمل الیوم (آج کل اسی پر عمل ہے) (۶) علیه عمل الامة (اسی پر امت کا عمل ہے)

(۷) هو الصحیح (یہی صحیح ہے) (۸) هو الاصح (یہی صحیح تر ہے)

(۹) هو الاظهر (یہی زیادہ واضح ہے) (۱۰) هو المختار فی زماننا (یہی ہمارے زمانے میں پسندیدہ ہے)

(۱۱) هو فتوی مشایخنا (یہی ہمارے علماء کا فتویٰ ہے۔

(۱۲) هو الاشبه (یہی صحیح قول سے زیادہ مشابہ ہے) (۱۳) هو الاوجه (یہی زیادہ مدلل ہے)

اوران کے علاوہ وہ الفاظ جو اس کتاب (قدوری) کے متن میں اپنی جگہ مذکور ہیں' ایسا ہی حاشیہ بزدوی میں[1] ہے۔ (جامع المضمرات کی عبارت پوری ہوئی) اور ان الفاظ میں سے بعض' بعض سے زیادہ مؤکد ہیں۔ مثلاً۔

(۱) لفظ فتویٰ' لفظ صحیح' اصح اور اشبہ وغیرہ سے زیادہ مؤکد ہے۔

(۲) اور لفظ بہ یفتی' لفظ الفتویٰ علیہ سے زیادہ مؤکد ہے۔

(۳) اور لفظ اصح' لفظ صحیح سے زیادہ مؤکد ہے۔

(۴) اور لفظ احوط' لفظ احتیاط سے زیادہ مؤکد ہے (فتاویٰ خیریہ کی عبارت پوری ہوئی)

صحیح اور اصح میں زیادہ مؤکد کون ہے؟

لیکن منیۃ المصلی کی شرح کبیری (ص ۵۸) میں مس مصحف کی بحث میں ہے کہ جو بات ہم نے اساتذہ سے حاصل کی ہے وہ یہ ہے کہ جب دو معتبر اماموں میں کسی مسئلہ کی تصحیح میں تعارض ہو جائے ایک کہے کہ صحیح یہ ہے اور دوسرا کہے کہ اصح یہ ہے تو جو صحیح کہتا ہے اس کا قول لینا زیادہ بہتر ہے اس امام کے قول سے جو اصح کہتا ہے۔ کیوں کہ صحیح کا مقابل فاسد ہے۔ اور اصح کا مقابل صحیح ہے پس جو اصح کہتا ہے وہ صحیح کہنے والے کی موافقت کرتا ہے۔ اس مسئلہ کے صحیح ہونے میں اور رہا وہ جو صحیح کہتا ہے تو اس کے نزدیک دوسرا حکم فاسد ہے پس اس قول کو لینا جس

---

[1] کتاب میں اس جگہ عبارت ہے (فی حاشیۃ البزدوی) یہ عبارت حل نہیں ہوئی' فتاویٰ خیریہ میں بھی اسی طرح ہے۔ شاید (و) رہ گیا ہے یا (کذا) رہ گیا ہے واللہ اعلم علائی رحمہ اللہ نے بھی الدر المختار (ج ۱ ص ۵۳) میں یہ عبارت ملخصاً نقل کی ہے۔۱۲

کے صحیح ہونے پر دونوں متفق ہیں زیادہ بہتر ہے اس قول کو لینے سے جو ان میں سے ایک کے نزدیک فاسد ہے اھ۔

اور علامہ ابن عبدالرزاق (۱۱۳) نے الدر المختار کی شرح مفاتیح الاسرار میں ذکر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ اصح، صحیح سے زیادہ مؤکد ہے اور علامہ بیری رحمہ اللہ کی شرح اشباہ میں ہے کہ فقہ شافعی کی کتاب اطہر از المذہب لاحکام المذہب (۱۱۴) میں حاشیہ بزدوی سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''ہوالصحیح چاہتا ہے کہ دوسرا قول غیر صحیح ہو اور لفظ الاصح چاہتا ہے کہ دوسرا قول صحیح ہو میں کہتا ہوں کہ اس میں ''اکثر'' کی قید بڑھانی مناسب ہے کیوں کہ ہم نے اصح کا مقابل روایت شاذہ کو بھی پایا ہے جیسا کہ شرح مجمع میں ہے اھ''

اور درمختار (ج۱ص۵۴) میں کبیری کی مذکورہ بالا عبارت کا خلاصہ نقل کرنے کے بعد علائی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پھر میں نے رسالہ آداب المفتی (۷) میں دیکھا کہ:

(۱) جب کسی معتمد کتاب میں کسی روایت کے آخر میں اصح، اولیٰ، اوفق یا اس کے مانند الفاظ بڑھائے جائیں تو مفتی کے لیے جائز ہے کہ وہ اس روایت پر فتویٰ دے اور اس کے بر خلاف روایت پر بھی فتویٰ دے۔ دونوں میں سے جس پر چاہے وہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

(۲) اور جب کسی روایت کے آخر میں صحیح، ماخوذ بہٖ، بہٖ یفتی یا علیہ الفتویٰ بڑھایا جائے تو مفتی اس کے برخلاف روایت پر فتویٰ نہیں دے سکتا۔

(۳) مگر مثال کے طور پر ہدایہ میں ہوالصحیح ہو اور کافی میں اس کے برخلاف روایت کے لیے ہوالصحیح کہا گیا ہو تو مفتی کو اختیار ہوگا وہ اپنی دانست میں قوی تر، زیادہ مناسب اور مفید تر قول کو اختیار کرے گا (آداب المفتی کی عبارت پوری ہوئی) لہٰذا یہ باتیں یاد رکھنی چاہئیں (درمختار کی عبارت پوری ہوئی)

خلاصۃ المرام:

میں کہتا ہوں کہ ان سب عبارتوں کا حاصل درج ذیل امور ہیں:

(۱) جب دو روایتوں میں سے ہر ایک کی ایک ہی لفظ سے تصحیح کی گئی ہو مثلاً دونوں میں سے ہر ایک کے لیے ہوالصحیح یا ہوالاصح یا بہٖ یفتی کہا گیا ہو تو مفتی کو اختیار ہوگا۔

(۲) اور جب تصحیح کے الفاظ مختلف ہوں تو اگر ان میں سے ایک میں فتویٰ کا لفظ ہو تو وہ قول اولیٰ ہے کیونکہ فتویٰ صحیح قول پر ہی دیا جاتا ہے اور ہر صحیح قول مفتی بہ نہیں ہوتا اس لیے کہ فی نفسہ صحیح قول پر بھی کبھی فتویٰ نہیں دیا جاتا بایں وجہ کہ زمانہ بدل جانے کی وجہ سے یا ضرورت کی وجہ سے یا اس قسم کے کسی اور سبب کی وجہ سے دوسرا قول زمانہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے غرض وہ قول جس کی تصحیح میں لفظ فتویٰ استعمال کیا گیا ہے وہ دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک اس قول پر فتویٰ دینے کی اجازت اور دوسری اس قول کا صحیح ہونا۔ کیونکہ اس قول پر فتویٰ دینا اس قول کی تصحیح ہے، برخلاف اس قول کے جس کی تصحیح بطور مثال لفظ صحیح یا اصح سے کی گئی ہو (کیونکہ ان الفاظ میں اس قول کی صرف صحت کا بیان ہے اس پر فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے)

(۳) اور اگر دونوں قولوں میں سے ہر ایک کی تصحیح میں لفظ فتویٰ استعمال کیا گیا ہے تو اگر ان میں سے کوئی جملہ مفید حصر ہے جیسے بہ یفتی یا علیہ الفتویٰ تو وہی قول زیادہ بہتر ہے اور یہی حکم بلکہ بدرجہ اولیٰ لفظ علیہ عمل الامہ کا ہے کیونکہ یہ لفظ اجماع کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

(۴) اور اگر دو قولوں میں سے کسی کی تصحیح میں لفظ فتویٰ نہیں ہے تو اگر ان میں سے ایک روایت کی اصح کے لفظ سے تصحیح کی گئی ہے اور دوسری کی صحیح کے لفظ سے تو اس میں وہ اختلاف ہے جو پہلے گزر چکا...... لیکن وہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ دونوں تصحیحیں دو کتابوں میں ہوں۔ اور اگر وہ دونوں لفظ کسی ایک ہی کتاب میں ایک ہی امام نے استعمال کئے ہوں تو پھر اصح کو صحیح پر مقدم کرنے میں مذکورہ بالا اختلاف متحقق نہیں ہوسکتا کیونکہ لفظ صحیح کا یہ آگاہی دینا کہ اس کا مقابل فاسد ہے اس صورت میں متحقق نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اس صورت میں صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کا مقابل اصح ہے۔ ہاں اگر مسئلہ میں تیسرا قول بھی ہو تو وہی فاسد ہوگا۔ اسی طرح اختلاف مذکور متحقق نہیں ہوسکتا اگر ایک امام نے دو تصحیحیں دو اماموں سے نقل کی ہوں پھر اس امام نے فرمایا ہو کہ......... مثال کے طور پر......... دوسری تصحیح پہلی تصحیح سے اصح ہے تو اس صورت میں بھی اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس امام کی مراد اس قول کو ترجیح دینا ہے جس کو اس نے اصح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس قسم کی مثالیں علامہ قاسم رحمہ اللہ کی تصحیح میں بہت ہیں۔

(۵) اور اگر دو تصحیحوں میں سے ہر ایک لفظ اصح کے ساتھ ہو یا لفظ صحیح کے ساتھ تو بلاشبہ

مفتی کو ان دونوں قولوں میں اختیار ہوگا جبکہ تصحیح کرنے والے دونوں امام ایک درجہ کے ہوں۔

(۶) اور اگر دو اماموں میں سے ایک اعلم ہو تو مفتی اسی کی تصحیح کو ترجیح دے گا مثلاً ان میں سے ایک قول فتاویٰ خانیہ میں ہے اور دوسرا فتاویٰ بزازیہ میں ...... ان دونوں کتابوں کا تذکرہ بطور مثال ہے ...... تو قاضی خان کی تصحیح زیادہ قوی ہے کیونکہ علامہ قاسم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ: ''قاضی خان اس بات کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی تصحیح پر اعتماد کیا جائے''

(۷) اسی طرح مفتی کو اختیار ہے اگر ایک ہی کتاب میں دو قولوں میں سے ایک کی لفظ اصح احوط اولیٰ یا اوفق کے الفاظ سے صراحۃً تصحیح کی گئی ہو اور دوسرے قول کی تصحیح سے سکوت اختیار کیا گیا ہو۔ کیونکہ ان الفاظ سے دوسرے قول کی صحت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن بہتر اس قول کو لینا ہے جس کے اصح ہونے کی صراحت کی گئی ہے اس کی صحت قوی تر ہونے کی وجہ سے۔

اور اسی طرح اگر ایک ہی کتاب میں صاحب کتاب نے دو قولوں میں سے ایک میں اصح اور دوسرے میں صحیح کی صراحت کی ہو تو اصح کو لینا زیادہ بہتر ہے۔

۶۱- وَانْ تَجِدْ تَصحِيحَ قَوْلَيْنِ وَرَدْ	فَاخْتَرْ لِمَا شِئْتَ، فَكُلٌّ مُعْتَمَدْ
۶۲- اِلَّا اِذَا كَانَا صَحِيحًا وَاصَحْ	اَوْقِيْلَ ذَا يُفْتى بِهٖ فَقَدْ رُجِحْ
۶۳- اَوْكَانَ فِي الْمُتُونِ اَوْقَوْلَ الْاِمَامْ	اَوْ ظَاهِرَ الْمَرْوِيِّ اَوْجُلَّ الْعِظَامْ
۶۴- قَالَ بِهٖ، اَوْكَانَ الْاِ سْتِحْسَانَا	اَوزَادَ لِلْاَوْقَافِ نَفْعًا بَانَا
۶۵- اَوْكَانَ ذَا اَوْفَقَ لِلزَّمَانْ	اَوْكَانَ ذَا اَوْضَحَ فِى الْبُرْهَانْ
۶۶- هٰذَا اِذَا تَعَارَضَ التَّصْحِيْحْ	اَوْلَمْ يَكُنْ اَصْلاً بِهٖ تَصْرِيْحْ
۶۷- فَتَاْخُذُ الَّذِيْ لَهٗ مُرَجِّحْ	مِمَّا عَلِمْتَهٗ فَهٰذَ الْاَوْضَحْ

ترجمہ: (۶۱) اور اگر آپ ایسے دو قولوں کی تصحیح پائیں جن میں سے ہر ایک وارد ہوا ہے۔ یعنی روایت کیا گیا ہے۔ تو آپ جس کا چاہیں انتخاب کریں، کیونکہ ہر ایک قول قابل اعتماد ہے۔

(۶۲) مگر جب دونوں صحیح اور اصح ہوں۔ یا (کسی ایک کے بارے میں) کہا گیا ہو کہ: ''اس پر فتویٰ دیا گیا ہے'' تو وہ بالیقین ترجیح دیا گیا ہے۔

(۶۳) یا ان میں سے ایک قول متون میں ہے یا وہ امام اعظم کا قول ہے۔ یا وہ ظاہر روایت ہے،

یا سارے بڑے..........

(۶۴) اس قول کے قائل ہیں، یا وہ استحسان ہے۔ یا وہ اوقاف کے لیے واضح طور پر فائدہ بڑھاتا ہے۔

(۶۵) یا یہ قول زمانہ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ یا یہ قول دلیل میں واضح تر ہے۔

(۶۶) یہ اس صورت میں ہے جب کہ تصحیح میں تعارض ہو۔ یا تصحیح کی بالکل تصریح نہ ہو۔

(۶۷) پس لیجیے آپ اس قول کو جس کے لیے کوئی مرجح ہو۔ ان مرجحات میں سے جن کو آپ جان چکے پس یہ نہایت واضح بات ہے۔

تصحیح کو ترجیح دینے کی دس صورتیں:

جب میں مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کی تصحیح کی علامتیں (مخصوص) بیان کر چکا اور یہ بھی بتا چکا کہ تصحیح کے بعض الفاظ میں، بعض سے زیادہ تاکید ہے اور اس کا فائدہ تصحیح میں تعارض کے وقت ہی ظاہر ہوتا ہے اور تعارض کی صورت یہ ہے کہ تصحیح کرنے والوں نے دونوں قولوں کی تصحیح کی ہو تو اب میں نے ان باتوں کو ان اشعار میں ایسی شاندار تفصیل سے پیش کیا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے ایسا بیان نہیں کیا اور یہ تفصیل انہی مضامین سے ماخوذ ہے جن کو میں پہلے ممہد کر آیا ہوں۔

اور وہ تفصیل یہ ہے کہ فقہاء کا یہ قول کہ:

> ''جب کسی مسئلہ میں دو قول تصحیح شدہ ہوں تو مفتی کو اختیار ہے'' یہ بات علی الاطلاق (ہر حال میں) نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جب کسی قول کے لیے کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو، نہ تصحیح سے پہلے نہ تصحیح کے بعد اور وجوہ ترجیح دس ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ ترجیح:

یہ ہے کہ ایک قول کی تصحیح لفظ صحیح سے ہو اور دوسرے کی لفظ اصح سے اور اس بارے میں گفتگو پہلے ہو چکی ہے اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ: ''مشہور قول اصح کی صحیح پر ترجیح ہے۔''

دوسری وجہ:

یہ ہے کہ ایک قول کی لفظ فتویٰ سے تصحیح کی گئی ہو اور دوسرے قول کی کسی اور لفظ سے، جیسا

کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

تیسری وجہ:

یہ ہے کہ تصحیح شدہ دو قولوں میں سے ایک قول متون میں ہو اور دوسرا قول متون کے علاوہ دیگر کتابوں میں۔ کیونکہ کسی بھی قول کی تصحیح نہ ہونے کی صورت میں متن والے قول کو مقدم کیا جاتا ہے اس لیے کہ متون نقل مذہب کے لیے تصنیف کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون پہلے گزر چکا ہے۔ پس اس صورت میں بھی یہی حکم ہو گا جب دنوں تصحیحیں متعارض ہوں۔ چنانچہ بحر باب قضاء الفوائت (ج ۲ ص ۸۶) میں ہے کہ: ''تصحیح اور فتویٰ میں اختلاف ہو گیا ہے اور اس قول پر جو متون کے موافق ہے عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔''

چوتھی وجہ:

یہ ہے کہ ان میں سے ایک امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہو اور دوسرا آپ کے کسی شاگرد کا کیونکہ کسی بھی قول کی تصحیح نہ ہونے کی صورت میں امام صاحب کا قول مقدم ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ پس تصحیح کے بعد بھی یہی حکم ہو گا۔

پانچویں وجہ:

یہ ہے کہ ایک قول ظاہر روایت ہو تو اس کو دوسرے قول پر مقدم کیا جائے گا۔ بحر کتاب الرضاع (ج ۳، ص ۲۲۲) میں ہے کہ: ''جب فتویٰ مختلف ہو تو ظاہر روایت کو ترجیح ہو گی'' اور باب المصرف (ج ۲، ص ۲۵۰) میں ہے کہ: ''جب تصحیح میں اختلاف ہو تو ظاہر روایت کی تفتیش کرنا اور اس کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔''

چھٹی وجہ:

یہ ہے کہ تصحیح شدہ دو قولوں میں سے ایک کے قائل تمام بڑے مشائخ ہوں۔ کیونکہ اشباہ کی شرح بیری میں ہے کہ: ''مشائخ سے جو طے شدہ جات مروی ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس قول کا اعتبار ہو گا جس کے قائل اکثر حضرات ہیں'' اور اس طرح کی بات ہم پہلے حاوی قدسی کے حوالہ سے بھی بیان کر آئے ہیں۔

ساتویں وجہ:

یہ ہے کہ ایک قول استحسان ہو اور دوسرا قیاس کیونکہ پہلے یہ بات آ چکی ہے کہ استحسان

ارجح ہے مگر چند مسائل میں۔

آٹھویں وجہ:

یہ ہے کہ ایک قول وقف کے حق میں زیادہ مفید ہو۔ علماء نے حاوی قدسی وغیرہ کتابوں میں اس وجہ ترجیح کی صراحت کی ہے کہ جن مسائل میں علماء کا اختلاف ہے ان میں فتویٰ اس قول پر دیا جائے گا جس میں وقف کا زیادہ نفع ہو۔

نویں وجہ:

یہ ہے کہ ان میں سے ایک قول زمانہ کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ جو قول لوگوں کے عرف کے موافق ہے یا اس میں لوگوں کے لیے زیادہ آسانی ہے وہ زیادہ قابل اعتماد ہے اور اسی وجہ سے علماء نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

(۱) گواہوں کا تزکیہ ضروری ہونے کے مسئلہ میں اور ظاہری عدالت پر فیصلہ نہ کرنے کے بارے میں زمانہ کے احوال بدل جانے کی وجہ سے کیونکہ امام اعظم رحمہ اللہ اس قرن میں تھے۔ جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بہتری کی گواہی دی ہے اور صاحبین کا زمانہ اس سے مختلف تھا۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں لوگوں میں جھوٹ پھیل چکا تھا اس لیے ان کے زمانہ میں گواہوں کا تزکیہ ضروری ہو گیا تھا۔

(۲) اسی طرح علماء نے تعلیم وغیرہ پر اجارہ جائز نہ ہونے کے سلسلہ میں ہمارے تینوں ائمہ کے قول سے عدول کیا ہے۔ کیونکہ زمانہ بدل گیا اور جواز کے فتویٰ کی ضرورت پیش آئی۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دسویں وجہ:

یہ ہے کہ ایک قول کی دلیل زیادہ واضح اور خوب ظاہر ہو۔ کیونکہ پہلے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ دلیل کی قوت کی وجہ سے بھی ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں دو تصحیحیں پائی جاتی ہوں اور وہ شخص جو دلیل میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے دیکھے کہ ان میں سے ایک قول کی دلیل زیادہ قوی ہے تو اس پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ ترجیح درج ذیل دو صورتوں میں ہیں۔

(۱) جب تصحیح میں تعارض ہو کیونکہ اس صورت میں دونوں قولوں میں سے ہر ایک قول

صحت میں دوسرے قول کے ہم پلہ ہوگا اس لیے جب ان میں سے کسی ایک قول میں کسی اور جہت سے زیادہ قوت پیدا ہوگی تو اس قول پر بہ نسبت دوسرے قول کے عمل کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

(۲) اسی طرح جب دو قولوں میں سے کسی بھی قول کی صراحۃً تصحیح نہ کی گئی ہو تو اس قول کو مقدم کیا جائے گا جس میں مذکورہ بالا وجوہ ترجیح میں سے کوئی وجہ پائی جاتی ہو مثلاً اس قول کا متون میں ہونا یا امام اعظم کا قول ہونا یا ظاہر روایت ہونا الی آخرہ۔

۶۸- وَاعْمَلْ بِمَفْهُوْمِ رَوَايَاتٍ أَتَى مَالَمْ يُخَالِفْ لِصَرِيْحٍ ثَبَتَا

ترجمہ: (۶۸) اور آپ ان روایتوں کے مفہوم پر عمل کریں جو وارد ہوئی ہیں۔ جب تک وہ کسی صریح ثابت شدہ بات کے خلاف نہ ہو۔

مفہوم اور اس کے اقسام:

یہ بات جان لیں کہ مفہوم[1] کی دو قسمیں ہیں:

(۱) مفہوم موافق: اور وہ یہ ہے کہ الفاظ مسکوت[2] (غیر مذکور) کے لیے منطوق[3] (مذکور) کا حکم ثابت ہونے پر دلالت کریں۔ کلام کو محض زبان کے محاورات کے اعتبار سے سمجھنے کی وجہ سے یعنی وہ دلالت کرنا غور وفکر اور رائے واجتہاد پر موقوف نہ ہو جیسے لَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ (ماں باپ کو ''ہوں'' بھی مت کہو) کی دلالت ''مارنے کی حرمت'' پر (اس کا دوسرا نام (فَحْوَى[4] الخطاب ہے)

(۲) مفہوم مخالف: اور وہ یہ ہے کہ الفاظ مسکوت کے لیے منطوق کے حکم کی ضد کے ثابت ہونے پر دلالت کریں (اس کی بہت سی مثالیں اس کی اقسام کے ضمن میں آ جائیں گی اور اس مفہوم کا دوسرا نام دلیل[5] الخطاب ہے)

---

۱ مفہوم: وہ بات جو کلام سے سمجھی گئی ہے۔

۲ مسکوت: وہ بات جو بیان نہیں کی گئی۔

۳ منطوق: بولی ہوئی یعنی بیان کی ہوئی بات۔

۴ فحویٰ: مضمون خطاب: کلام۔

۵ دلیل: راہ نمائی۔

اور مفہوم مخالف کی متعدد اقسام ہیں (چند قسمیں درج ذیل ہیں)

(۱) مفہوم صفت: (اور وہ یہ ہے کہ کوئی حکم اسم صفت پر لگایا جائے تو جہاں وہ صفت نہ رہے گی حکم بھی نہ رہے گا) جیسے فِی السَّائِمَۃ زکوٰۃ (جنگل کی مباح گھاس چرنے والے چوپایوں میں زکوٰۃ ہے اس قول میں لفظ السائمۃ اسم مشتق ہے جو صفت پر دلالت کرتا ہے پس جو جانور سائمہ نہ ہوں گے بلکہ علوفہ ہوں گے ان میں زکوٰۃ نہ ہوگی)

(۲) مفہوم شرط: (اور وہ یہ ہے کہ کوئی حکم شرط کے ساتھ معلق کیا جائے تو جب شرط منتفی ہوگی تو حکم بھی منتفی ہوگا) جیسے وَاِنْ کُنَّ اُولاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْھِنَّ (اور اگر مطلقہ عورتیں حمل والی ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان پر خرچ کرو)

(۳) مفہوم غایت: (اور وہ یہ ہے کہ حکم کی کوئی حد مقرر کی گئی ہو تو اس غایت پر حکم خود بخود منتہی ہو جائے گا) جیسے حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ (مطلقہ ثلاثہ شوہر کے لیے حرام ہے یہاں تک کہ وہ اس (شوہر اول) کے علاوہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے)

(۴) مفہوم عدد: (اور وہ یہ ہے کہ حکم کی کوئی تعداد بیان کی گئی ہو تو وہ زائد کی نفی کرے گا) جیسے ثمانین جلْدۃً (تہمت لگانے والوں کو اسی کوڑے مارو)

(۵) مفہوم لقب: اور وہ یہ ہے کہ حکم کسی اسم جامد پر معلق کیا جائے جیسے فِی الْغَنَمِ زکوٰۃٌ (بھیڑ بکریوں میں زکوٰۃ ہے)

مفہوم کا حکم:

مفہوم کی دو قسموں میں سے پہلی قسم بالاتفاق معتبر ہے[1] اور دوسری قسم میں مع اس کی تمام اقسام کے اختلاف ہے شوافع کے نزدیک آخری قسم (مفہوم لقب) کے علاوہ سب معتبر ہیں۔ ان کے نزدیک یہی نص علوفۃ (گھر پر چارہ دیے جانے والے چوپایوں میں زکوٰۃ نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور دوسری اس عورت کے لیے نفقہ نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے جس کو طلاق بائنہ دی گئی ہو اور وہ حاملہ نہ ہو (اس کو مبتوتہ حائلہ کہتے ہیں) اور تیسری مطلقہ ثلاثہ کی حلت پر دلالت کرتی ہے جب کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے (اور وہ جماع کے بعد طلاق دے دے یا مر جائے۔ یعنی حلت کے ثبوت کے لیے کسی اور نص کی ضرورت نہیں ہے اسی نص سے غایت کے بعد حلت ثابت ہوگی) اور چوتھی تہمت لگانے کی سزا میں اسی کوڑوں سے زائد کی نفی کرتی ہے۔

---

[1] کیونکہ وہ دلالت النص سے استدلال ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک صرف نصوص شرعیہ (قرآن و حدیث) میں دوسری قسم مع اس کی جملہ اقسام کے معتبر نہیں ہے اور اس مسئلہ کی مکمل تحقیق اصول فقہ کی کتابوں میں ہے۔

بول چال' معاملات اور عقلیات میں مفہوم مخالف معتبر ہے

تحریر کی شرح تقریر (ج۱ص۱۱۷) میں مصنف کے قول ''غیر معتبر فی کلام الشارع فقط'' کے بعد کہا ہے کہ شیخ جلال الدین خبازی (۱۱۵) نے ہدایہ کے حاشیہ میں شمس الائمہ کردری (۸۴) سے نقل کیا ہے کہ شارع کے ارشادات میں کسی چیز کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ اس کے ماسوا سے حکم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا اور لوگوں کی باہمی گفتگو' عرف' معاملات اور دلائل عقلیہ میں دلالت کرتا ہے (خبازی کی عبارت پوری ہوئی) اور متاخرین نے اس بات کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اسی پر وہ مسئلہ متفرع معلوم ہوتا ہے جو خزانۃ الاکمل اور خانیہ میں ہے کہ اگر کسی نے کہا کہ: ''آپ کے میرے ذمہ سو درہم سے زیادہ نہیں ہے'' تو یہ سو کا اقرار ہو گیا۔ اور اس پر اس صورت میں کوئی چیز لازم نہ ہونے سے اشکال وارد نہیں ہوتا جبکہ کہا ہو کہ ''آپ کے میرے ذمہ سو درہم سے زیادہ بھی نہیں ہیں اور کم بھی نہیں ہیں'' جیسا کہ دونوں میں غور کرنے پر فرق پوشیدہ نہیں ہے۔ (التقریر کی عبارت پوری ہوئی)

عبارات فقہیہ اور اقوال صحابہ میں مفہوم مخالف معتبر ہے:

اور النہر الفائق کی کتاب الحج میں ہے کہ ''مفہوم مخالف روایات میں بالاتفاق معتبر ہے اور صحابہ کے ارشادات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں' صاحب نہر نے فرمایا کہ اقوال صحابہ میں یہ قید بڑھانی مناسب ہے کہ: ''وہ رائے واجتہاد سے جانے جا سکتے ہوں'' وہ اقوال مراد نہیں ہیں جو رائے واجتہاد سے نہیں جانے جا سکتے۔''

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ صحابہ کے ایسے ارشادات جو رائے و اجتہاد سے نہ جانے جا سکتے ہوں وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں' وہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں شامل ہیں اور احادیث میں مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ پس صاحب نہر کی ''روایات'' سے مراد وہ باتیں ہیں جو کتب فقہیہ میں مجتہدین سے مروی ہیں۔ خواہ وہ مجتہدین صحابہ کرام ہوں یا بعد کے حضرات اور النہر ہی میں سنن وضوء کے بیان میں ہے کہ: ''کتب فقہیہ میں مفہوم مخالف حجت ہے اور نصوص کے بیشتر مفہومات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔''

اور غایۃ البیان میں جہاں صاحب ہدایہ (ج ۱ ص ۳۷) نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ غسل جنابت میں عورت پر بنی ہوئی چوٹیاں کھولنا واجب نہیں، قوام الدین امیر کاتب اتقانی (۴) نے لکھا ہے کہ:

''عورت کے لفظ سے مرد سے احتراز مقصود ہے اور روایات فقہیہ میں کسی چیز کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا بالاتفاق اس کے ماسوا کی نفی پر دلالت کرتا ہے، برخلاف نصوص کے، کیونکہ نصوص میں ہمارے نزدیک اس کے ماسوا کی نفی پر دلالت نہیں کرتا''

اور غایۃ البیان ہی میں باب جنایات الحج میں جہاں صاحب ہدایہ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب درندہ محرم پر حملہ کرے اور وہ اس کو قتل کر دے تو اس پر کوئی جزاء واجب نہیں ہے اس روایت کی وجہ سے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک درندہ کو قتل کیا اور ایک مینڈھے کا دم دیا اور ارشاد فرمایا کہ: ''ہم نے ابتداء کی تھی (ہدایہ ج ۱ ص ۲۶۳) اس مسئلہ کی شرح کرتے ہوئے اتقانی (۴) نے لکھا ہے کہ:

''حضرت عمرؓ نے دم دینے کی وجہ اپنی طرف سے ابتداء کرنے کو بیان کیا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب محرم نے قتل کرنے میں ابتداء نہ کی ہو بلکہ درندہ کے حملہ کو ہٹانے کے لیے اس کو قتل کیا ہو تو محرم پر کوئی جزاء واجب نہیں ہے ورنہ حضرت عمرؓ کی بیان کی ہوئی وجہ کا کوئی فائدہ باقی نہ رہے گا۔''

شبہ:

اور یہ نہ کہا جائے کہ کسی چیز کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا احناف کے نزدیک اس کے ماسوا سے حکم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا، پھر حنفیہ حضرت عمرؓ کے قول سے کیسے استدلال کرتے ہیں؟

جواب:

اس لیے کہ میں کہوں گا کہ وہ قاعدہ شریعت کے ارشادات میں ہے، رہی روایات اور استدلالات عقلیہ تو ان میں دلالت کرتا ہے اور حضرت عمرؓ کا وجہ بیان کرنا استدلالات عقلیہ کے قبیل سے ہے (غایۃ البیان کی عبارت پوری ہوئی)

اور مذکورہ بالا عبارت کا حاصل یہ ہے کہ احکام پر استدلال کبھی تو نص شرعی یعنی کسی آیت

یا حدیث سے کیا جاتا ہے۔ اور کبھی عقلی استدلال ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا ہے اور عقلی دلائل شارع کے کلام میں شمار نہیں ہیں اس لیے ان کا مفہوم مخالف معتبر ہوگا اور اسی وجہ سے فقہاء کہتے ہیں کہ: ''اس علت کا تقاضا فلاں بات کا جواز یا عدم جواز ہے'' غرض وہ علتوں کے مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں۔

باہمی گفتگو میں مفہوم مخالف معتبر ہونے پر اعتراض:

اب اگر آپ کہیں کہ الاشباہ کی کتاب القضا میں ہے کہ ''ظاہر روایت میں مفہوم مخالف سے استدلال لوگوں کے کلام میں جائز نہیں ہے جس طرح دلائل (نصوص) میں جائز نہیں ہے۔ رہا (فقہی) روایات کا مفہوم مخالف تو وہ حجت ہے جیسا کہ غایۃ البیان کی کتاب الحج میں ہے'' (حموی ج۲ ص ۳۳۶)

ابن نجیم کا یہ قول پہلے گزری ہوئی بات کے خلاف ہے کہ مفہوم مخالف صرف شارع کے کلام میں معتبر نہیں ہے۔

جواب:

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں کہ متاخرین کی رائے وہی ہے جس کو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

نصوص شرعیہ میں مفہوم مخالف اور امام محمدؒ:

اور علامہ بیری رحمہ اللہ نے شرح اشباہ میں لکھا ہے کہ:

> ''وہ بات جو فتاویٰ ظہیریہ میں ہے وہ یہ ہے کہ مفہوم مخالف سے استدلال جائز نہیں اور یہی ہمارے علماء کی ظاہر روایت ہے اور وہ بات جس کو امام محمدؒ نے سیر کبیر میں ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم مخالف سے استدلال جائز ہے وہ بات ظاہر روایت کے خلاف ہے۔''

کشف کے حواشی میں کہا ہے کہ میں نے فوائد ظہیریہ کے باب مایکرہ فی الصلوۃ میں دیکھا ہے کہ مفہوم سے استدلال جائز ہے اس کو شمس الائمہ سرخسیؒ نے سیر کبیر میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں مفہوم مخالف سے استدلال کے جواز پر مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ اور امام خصاف رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے اور انہوں نے کتاب الحِیَل میں

مسائل کا اسی پر مدار رکھا ہے اور مصفّٰی میں ہے کہ کسی چیز کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ اس کے ماسوا کی نفی پر دلالت نہیں کرتا' ہم کہتے ہیں کہ روایات فقہیہ میں' لوگوں کی باہمی گفتگو میں اور دلائل عقلیہ میں اس کے ماسوا کی نفی پر دلالت کرتا ہے (مصفّٰی کی عبارت پوری ہوئی جو اس کی کتاب النکاح سے منقول ہے) اور خزانۃ الروایات میں ہے کہ فقہی روایت میں مذکور قید اس کے ماسوا کی نفی کرتی ہے اور فتاویٰ سراجیہ میں ہے کہ لوگوں کی باہمی گفتگو میں جواز قبیل اطلاعات ہے' کسی چیز کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا بالیقین اس کے ماسوا کی نفی پر دلالت کرتا ہے' سرخسیؒ نے ایسا ہی بیان کیا ہے (سراجیہ کی عبارت پوری ہوئی) میں (علامہ بیریؒ) کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ عمل اس بات پر ہے جو سیر کبیر میں ہے جیسا کہ اس کو خصاف (۱۶) نے کتاب الحیل میں اختیار کیا ہے اور ہم نے اس کی مخالفت کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا واللہ تعالیٰ اعلم (علامہ بیری کی عبارت پوری ہوئی)

علامہ شامی رحمہ اللہ وضاحت کرتے ہیں کہ معمول بہ مفہوم مخالف سے استدلال کا جواز ہے مگر ہر جگہ نہیں بلکہ شارع کے کلام کے علاوہ میں' جیسا کہ آپ یہ بات اس تفصیل سے جان چکے ہیں جو ہم پہلے عرض کر آئے ہیں ورنہ جو بات میں نے سیر کبیر میں دیکھی ہے وہ تو مفہوم مخالف پر عمل کا جواز ہے شارع کے کلام تک میں۔ کیونکہ امام محمد رحمہ اللہ نے باب آنیۃ المشرکین وذبائحھم میں ذکر کیا ہے کہ دارالحرب کی عیسائی عورتوں سے نکاح ناجائز نہیں ہے اور امام محمدؒ نے اس پر حضرت علیؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ھَجَرْ کے مجوسیوں کو نامہ بھیجا جس میں ان کو اسلام کی دعوت دی پھر جو مسلمان ہو جائے اس کا اسلام قبول کر لیا جائے اور جو مسلمان نہ ہو اس پر جزیہ مقرر کیا جائے اور مجوسیوں کا ذبیحہ نہ کھایا جائے نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

> ''گویا امام محمدؒ نے رسول اللہ ﷺ کے مجوسیوں کی اس حکم کے ساتھ تخصیص فرمانے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی گنجائش ہے کیونکہ امام محمدؒ نے اپنی اس کتاب کا مدار اس بات پر رکھا ہے کہ مفہوم مخالف حجت ہے اور اس کی وضاحت اس کی جگہ میں آئے گی'' (شرح سیر کبیر ج ۱ ص ۱۴۸)

پھر چار ابواب کے بعد باب ما یجب من طاعۃ الوالی میں امام محمدؒ کے اس قول کی

شرح میں کہ: ''اگر امیر لشکر کا منادی اعلان کرے کہ جو فوجی چارہ لینے جانا چاہتا ہے وہ فلاں شخص کے جھنڈے تلے (سرکردگی میں) جائے تو یہ بمنزلہ ممانعت ہے'' سرخسیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یعنی فوجیوں کو جھنڈے والے سے علیحدہ ہونے کی ممانعت کر دی گئی ہے' اس کے ساتھ نکلنے کے بعد' اور ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ امام محمدؒ نے اس کتاب کا مدار اس پر رکھا ہے کہ مفہوم مخالف حجت ہے اور ہمارے نزدیک ظاہر روایت یہ ہے کہ مفہوم مخالف حجت نہیں ہے۔ مفہوم صفت اور مفہوم شرط اس بارے میں یکساں ہیں۔ مگر امام محمدؒ نے اس مقصد کو پیش نظر رکھا ہے جس کو عام لوگ ایسے موقع پر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ فوجی عام طور سے علوم کے حقائق سے ناآشنا ہوتے ہیں اور ان کے امیر نے اس اعلان کے ذریعہ فوجیوں کو باہر جانے سے روک دیا ہے' صرف مخصوص آدمی کے جھنڈے تلے جانے کی اجازت دی ہے اس لیے امام محمدؒ نے اس ممانعت کو جو امیر کے کلام کی دلالت سے مفہوم ہوتی ہے مصرح نہی کی طرح قرار دے دیا ہے۔'' (شرح سیر کبیر ج ا' ص ۱۷۷)

علامہ شامی کی وضاحت:

اور سرخسیؒ کے کلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ظاہر روایت میں مفہوم مخالفت حجت نہیں ہے یہاں تک کہ لوگوں کے کلام میں بھی۔ کیونکہ امام محمدؒ نے اس باب میں امیر کا جو کلام ذکر کیا ہے وہ کلام الناس ہے شارع کا کلام نہیں ہے اور یہ بات اس قول کے موافق ہے جو اشباہ کے حوالہ سے گزر چکی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ کلام الناس میں مفہوم مخالف کے حجت ہونے کا قول متاخرین کا ہے جیسا کہ تحریر کی شرح کی پہلے ذکر کی ہوئی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے اور متاخرین کا مستند اس بارے میں شاید وہ ہے جس کو ہم ابھی سیر کبیر کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں اس لیے کہ یہ کتاب ظاہر روایت کی چھ کتابوں میں سے ہے بلکہ وہ ان میں سب سے آخری تصنیف ہے۔ اس لیے عمل اس پر ہوگا جیسا کہ ہم پہلے یہ بات اشعار میں بیان کر چکے ہیں۔

خلاصۃ المرام:

اور ماحصل یہ ہے کہ اب عمل شارع کے کلام کے علاوہ میں مفہوم مخالف کے معتبر

ہونے پر ہے۔ کیونکہ شارع کے کلام میں کسی چیز کا صراحۃً تذکرہ ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس کا مفاد اس کے ماسوا سے حکم کی نفی ہی ہو۔ اس لیے کہ شارع کا کلام بلاغت کا مخزن ہے۔ پس شارع کی مراد کبھی کچھ اور ہوتی ہے۔ جیسے ارشاد باری وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ (تمہارے لیے حرام کی گئی ہیں تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری گود (پرورش) میں ہیں اس آیت میں حجور کی قید کا فائدہ (بالا جماع) یہی ہے کہ عام طور پر بیوی کی سابق شوہر سے لڑکی دوسرے شوہر کی پرورش میں ہوتی ہے (یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اگر وہ لڑکی موجودہ شوہر کی پرورش میں نہ ہوتو اس سے نکاح جائز ہے) اور رہا لوگوں کا کلام تو وہ اس خوبی سے خالی ہوتا ہے لہذا ان کے کلام میں مفہوم مخالف سے استدلال کیا جائے گا۔ کیونکہ لوگوں میں متعارف یہی بات ہے۔ اور سیر کبیر کی شرح میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ: ''جو بات عرف سے ثابت ہوتی ہے وہ نص سے ثابت کی طرح ہوتی ہے'' (الثَّابِتُ بِالْعُرْفِ کَالثَّابِتِ بِالنَّصِ) اور یہ قاعدہ فقہاء کے اس قول سے ملتا جلتا ہے کہ معروف بات مشروط جیسی ہوتی ہے (المعروف کالمشروط) اور اس صورت میں جو بات عرف سے ثابت ہو وہ گویا ایسی ہے کہ قائل نے اس کی صراحت کر دی ہے اس لیے اس پر عمل کیا جائے گا (یعنی لوگوں کے محاورات میں لوگوں ہی کے عرف سے ثابت ہے کہ مفہوم مخالف کا اعتبار کیا جائے گا)

اور روایات فقہیہ کے مفہوم مخالف کے بارے میں بھی یہی بات کہی جائے گی (کہ وہ معتبر ہے) کیونکہ علماء کی ان کتابوں میں یہ عادت رہی ہے کہ وہ قیود و شروط وغیرہ یہ تنبیہ کرنے کے لیے ذکر کرتے ہیں کہ جہاں یہ قید و شرط نہ پائی جائے وہ حکم سے خارج ہے اور مسکوت کا حکم منطوق کے برخلاف ہے اور یہ بات فقہاء کے درمیان بلانکیر شائع و ذائع ہے اور اسی وجہ سے کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکتا جس نے اس کے خلاف تصریح کی ہو۔

البتہ یہ بات اکثری ہے (کلی نہیں ہے) جیسا کہ اس کو نقایہ کی شرح جامع الرموز میں قہستانی نے ہدایہ کی شرح نہایہ کی کتاب الحدود کی طرف منسوب کیا ہے اور مستثنیات میں سے صاحب ہدایہ کا یہ قول ہے کہ:

''طہارت کی سنتیں: دونوں ہاتھوں کو دھونا ہے ان کو برتن میں ڈالنے سے پہلے جب وضو کرنے والا نیند سے بیدار ہو۔''

مسئلہ مذکورہ میں نیند سے بیدار ہونے کی قید اتفاقی ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ سے برکت حاصل کرنے کے لیے یہ قید بڑھائی گئی ہے۔ کیونکہ طہارت کی یہ سنت اکثر فقہاء کے نزدیک نیند سے بیدار ہونے والے اور پہلے سے بیدار سب کو عام ہے اور ایک ضعیف قول یہ ہے کہ یہ قید احترازی ہے، پہلے سے بیدار آدمی کو نکالنے کے لیے ہے۔ اور شمس الائمۃ کردری رحمہ اللہ کا میلان اسی قول کی طرف ہے۔

مفہوم مخالف اس وقت حجت ہے جب وہ صراحت کے خلاف نہ ہو:

اور میرا قول مالم یخالف لصریح ثبتا (جب تک مفہوم مخالف کسی صریح ثابت شدہ بات کے خلاف نہ ہو) یعنی مفہوم مخالف اس تفصیل کے مطابق حجت ہے جو ہم نے بیان کی بشرطیکہ وہ کسی صریح بات کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ صریح بات مفہوم پر مقدم ہوتی ہے جیسا کہ طرسوی (۵۰) وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے اور ائمہ اصول نے اس کو ادلہ کی ترجیح کی بحث میں ذکر کیا ہے۔ کیونکہ جو حضرات دلائل شرعیہ میں مفہوم مخالف کے معتبر ہونے کے قائل ہیں وہ اسی صورت میں اس کا اعتبار کرتے ہیں جب کوئی صریح بات اس کے خلاف موجود نہ ہو، ورنہ صریح کو مقدم کیا جائے گا اور مفہوم کو لغو کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

۶۹- وَالْعُرف فی الشَّرع لَهُ اعْتِبَارُ لِذَا عَلَيْهِ الْحکمُ قَدْيُدَارُ

ترجمہ: (۶۹) عرف کا شریعت میں اعتبار ہے۔ اسی وجہ سے کبھی اس پر حکم کا مدار رکھا جاتا ہے۔

عرف کی تعریف:

مستصفی میں فرمایا کہ: عرف، عادت وہ ہے جو عقل کی رو سے دلوں میں جم جائے اور اس کو سلیم فطرتیں قبول کرلیں۔''

عادت کی تعریف:

اور التحریر کی شرح میں ہے کہ: ''عادت وہ بات ہے جو کسی عقلی ربط کے بغیر بار بار پیش آئے۔''

عرف و عادت کا اعتبار:

اور الاشباہ والنظائر (ص۹۳) میں ہے کہ: ''چھٹا قاعدہ: عادت فیصلہ[1] کن چیز ہے (اَلْعَادَۃُ مُحَکَّمَۃٌ) اور اس کی بنیاد یہ حدیث شریف ہے کہ:

مَارَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حسن.[2]

جس چیز کو سب مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی چیز ہے۔

اور یہ بات جان لیں کہ بہت سے مسائل میں عرف و عادت کا اعتبار کیا گیا ہے یہاں تک کہ اس کو ایک مستقل اصول قرار دیا گیا ہے چنانچہ علماء کہتے ہیں کہ لفظ کے حقیقی معنی استعمال اور عرف و عادت کے قرینہ سے چھوڑ دیئے جائیں گے (اشباہ کی عبارت پوری ہوئی)

اعتبار عرف عام اور عادت غالبہ کا ہے:

پھر اشباہ (ص۹۴) میں بیان کیا ہے کہ عادت کا اعتبار اسی وقت کیا جاتا ہے جب وہ عام یا غالب ہو جائے اور اسی وجہ سے علماء نے بیع کے اس مسئلہ میں فرمایا ہے کہ:

''اگر کسی جگہ مختلف کرنسیاں رائج ہوں اور ان کی مالیت اور رواج مختلف ہو اور کوئی شخص دراہم و دنانیر کے بدلے کوئی چیز بیچے تو اس معاملہ کو اس کرنسی کی طرف پھیر دیا جائے گا جس کا رواج عام ہے۔

ہدایہ (ج۳، ص۴) میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ غالب کرنسی ہی متعارف ہے اس لیے مطلق بیع کو اسی کرنسی کی طرف پھیرا جائے گا (اشباہ کی عبارت پوری ہوئی)

عرف سے ثابت حکم کا درجہ:

اور علامہ بیری کی شرح میں مبسوط سے منقول ہے کہ جو بات عرف سے ثابت ہوتی ہے وہ نص سے ثابت ہونے والی بات کی طرح ہے (الثابت بالعرف کالثابت بالنص)

---

[1] مُحَکَّمَۃٌ مشتق من التحکیم الخ المدخل الفقھی العام ج۲ ص۹۹۹ و شرح القواعد الفقھیہ للزرقاء ص۲۱۹)

[2] علائی کہتے ہیں کہ مجھے یہ مرفوع حدیث کسی کتاب میں نہیں ملی، سند ضعیف سے بھی نہیں ملی۔ سوال و تحقیق کے بعد بھی سراغ نہیں ملا یہ حدیث موقوف ہے یعنی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے جس کی امام احمد نے اپنی سند میں تخریج کی ہے (رسائل ابن عابدین ج۲ ص۱۱۵) مزید دیکھیں نصب الرایہ ج۲ ص۱۳۳)

عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں:

اس کے بعد یہ بات جاننی چاہیے کہ بہت سے وہ احکام جو صاحب مذہب مجتہد نے اپنے عرف اور اپنے زمانہ کے احوال پر بنیاد رکھ کر صراحۃً بیان کیے تھے وہ زمانہ بدلنے کی وجہ سے بدل گئے ہیں اور زمانہ کی تبدیلی یا تو لوگوں میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے یا عام ضرورت پیش آ جانے کی وجہ سے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ متاخرین نے تعلیم قرآن پر اجارہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور متاخرین نے گواہوں میں ظاہری عدالت کافی نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں امام ابوحنیفہؒ کی تصریح کے خلاف ہیں۔ اور اسی قبیل کے مسائل میں سے ہیں:

(۱) بادشاہ (گورنمنٹ) کے علاوہ کی طرف سے اکراہ (زبردستی) کا متحقق ہونا۔ حالانکہ یہ بات امام صاحب کے قول کے خلاف ہے۔ امام صاحب کا ارشاد ان کے اپنے زمانہ کے احوال پر مبنی تھا کہ بادشاہ کے علاوہ کی طرف سے اکراہ ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر بگاڑ بڑھ گیا اور غیر سلطان کی طرف سے بھی اکراہ ہونے لگا تو امام محمدؒ نے اس کا اعتبار کر لیا اور متاخرین نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا۔

(۲) حکومت میں مخبری کرنے والے کو ضامن بنانا' حالانکہ یہ بات مذہب کے اس قاعدہ کے خلاف ہے کہ: ''ضمان مباشر (خود کرنے والے) پر ہے سبب بننے والے پر نہیں ہے'' مگر متاخرین نے زمانہ بگڑ جانے کی وجہ سے بطور جز رسائی (مخبری کرنے والے) کے ضمان کا فتویٰ دیا۔ بلکہ فتنہ[۱] (خانہ جنگی) کے زمانہ میں تو اس کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔

(۳) اجیر مشترک (دھوبی' درزی وغیرہ) کو نقصان کا ضامن قرار دینا۔

(۴) فقہاء کا یہ فرمانا کہ اب اس زمانہ میں وصی کے لیے یتیم کے مال سے مضاربت جائز نہیں۔

(۵) متاخرین کا یہ فتویٰ ہے کہ یتیم اور وقف کی جائداد غصب کرنے والے کو ضامن بنایا جائے گا۔

(۶) اور اسی قبیل سے یہ فتویٰ ہے کہ یتیم اور وقف کی جائداد اگر مکانات ہوں تو ایک

---

[۱] ہندوستانی نسخہ ص ۹۶ میں اس جگہ لفظ (الفترۃ) ہے وہ تصحیف ہے۔ صحیح لفظ (الفتنۃ) ہے ۱۲

سال سے زیادہ اور صحرائی جائداد ہو تو تین سال سے زائد مدت کے لیے کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔

حالانکہ یہ دونوں باتیں اصل مذہب کے خلاف ہیں نمبر ۵ میں اصل مذہب ضمان کا واجب نہ ہونا ہے اور نمبر ۶ میں اجارہ کے لیے کسی مدت کا عدم تعین ہے۔

(۷) متاخرین کا قاضی کو اپنی معلومات کے مطابق فیصلہ کرنے سے روک دینا۔

(۸) متاخرین کا یہ فتویٰ کہ شوہر اپنی بیوی کو دور منتقل نہیں کرسکتا اگر چہ وہ بیوی کو اس کا پورا مہر معجل (نقد) دے چکا ہو یہ فتویٰ فسادِ زمانہ کی وجہ سے ہے۔

(۹) متاخرین کا یہ فتویٰ کہ شہادت کے بغیر شوہر کی یہ بات نہیں مانی جائے گی کہ اس نے بیوی کی طلاق کی قسم کھانے کے بعد ان شاء اللہ کہہ لیا تھا حالانکہ یہ فتویٰ ظاہر روایت کے خلاف ہے اور متاخرین نے اپنے فتویٰ کی وجہ زمانہ کے بگاڑ کو قرار دیا ہے۔

(۱۰) متاخرین کا یہ فتویٰ کہ صحبت ہو جانے کے بعد عورت کی یہ بات تسلیم نہیں کی جائے گی کہ اس نے اپنا وہ مہر وصول نہیں کیا جس کی تعجیل نکاح میں شرط تھی۔ حالانکہ عورت مہر کی وصولی کی منکر ہے۔ اور مذہب کا ضابطہ یہ ہے کہ: "منکر کی بات مانی جاتی ہے" مگر رواج یہ ہے کہ عورت مہر معجل وصول کیے بغیر اپنا نفس سپرد نہیں کرتی۔

(۱۱) اور اسی قبیل سے متاخرین کا یہ قول ہے کہ اگر شوہر کہے کہ كُلُّ حِلٍّ عَلَيَّ حَرَامٌ (ہر جائز چیز مجھ پر حرام ہے) تو بر بنائے عرف اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ بلخ کے فقہاء نے کہا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کا یہ قول کہ: "نیت کے بغیر طلاق واقع نہ ہوگی" ان کے علاقہ کے عرف کی بنا پر تھا اور ہمارے عرف میں لوگ اس قول سے بیوی کو حرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اسی پر محمول کیا جائے گا۔ مشائخ بلخ کی یہ بات علامہ قاسم رحمہ اللہ نے نقل کی ہے اور انہوں نے مختارات النوازل سے نقل کیا ہے کہ اس پر فتویٰ ہے کیونکہ عرف میں عام استعمال یہی ہے۔

پھر علامہ قاسم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے علاقہ میں وہ الفاظ جو بیوی کو حرام کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) الطَّلَاقُ يَلْزَمُنِي (مجھ پر طلاق لازم ہو) (۲) اَلْحَرَامُ يَلْزَمُنِي (مجھ پر حرام لازم

ہو (۳) عَلَيَّ الطَّلَاقُ (مجھ پر طلاق ہو) (۴) عَلَيَّ الْحَرَامُ (مجھ پر حرام ہے)

(۱۲) باپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں نے اپنی لڑکی کو جہیز کا مالک نہیں بنایا۔ فقہاء نے اس مسئلہ کا مدار بھی عرف پر رکھا ہے حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ: ''مالک بنانے نہ بنانے کے سلسلے میں مالک بنانے والے کا قول معتبر ہے۔

(۱۳) ادھار مہر کے سلسلہ میں عورت کی بات تسلیم کرنا حالانکہ منکر کی بات مانی جاتی ہے۔

(۱۴) فقہاء کا یہ فرمانا کہ ہمارے زمانہ میں ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے مزارعت' مساقات اور وقف میں صاحبین کا قول مختار ہے۔

(۱۵) امام محمد رحمہ اللہ کا یہ ارشاد کہ اگر شفیع ایک ماہ تک فروخت شدہ جائداد کے مالک بننے کی کارروائی نہ کرے تو اس کا شفعہ کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ امام محمدؒ نے یہ بات مشتری کے ضرر کو دور کرنے کے لیے کہی ہے۔

(۱۶) اور اسی قبیل سے حسن بن زیادؒ کی یہ روایت ہے کہ آزاد عاقل بالغ عورت اگر اپنا نکاح غیر کفو میں کر لے تو نکاح درست نہیں ہوتا۔

(۱۷) اور اسی قبیل سے متاخرین کا ضرورت کی بنا پر طینِ شارع (راستہ کی کیچڑ) کو نظر انداز کرنے کا فتویٰ ہے۔

(۱۸) اور بیع[1] بالوفا کے جواز کا فتویٰ ہے۔

(۱۹) استصناع (آرڈر دے کر کوئی چیز بنوانے) کے جواز کا فتویٰ (حالانکہ وہ معدوم کی بیع ہے)

(۲۰) پانی کی مقدار متعین کیے بغیر سقہ سے پانی پینے کے جواز کا فتویٰ۔

---

[1] وفاء کے معنی ہیں پورا ادا کرنا اور بیع بالوفا کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو پیسوں کی ضرورت ہے وہ اپنی کوئی چیز زمین مکان وغیرہ کسی کو بیچتا ہے اور آپس میں معاملہ طے کر لیا جاتا ہے کہ جب بائع پورا ثمن لوٹا دے تو مشتری بیع لوٹانے کا پابند ہے یعنی وہ سابقہ قیمت ہی پر وہ چیز بائع کو بیچ دینے کا پابند ہے۔ رہن سے چونکہ انتفاع حرام تھا اس لیے لوگوں نے یہ ایک حیلہ نکالا تھا۔ بیع بالوفاء کے جواز وعدم جواز میں شدید اختلاف تھا۔ مصر کے علماء عام طور پر اس کو جائز کہتے تھے۔ درمختار اور شامی میں کتاب البیوع باب الصرف میں اور بحر میں باب خیار الشرط میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ ہمارے اکابر نے اس بیع کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔۱۲

(۲۱) ٹھہرنے کی مدت اور استعمال ہونے والے پانی کی مقدار متعین کئے بغیر حمام[1] میں نہانے کے جواز کا فتویٰ۔

(۲۲) تولے بغیر گوندھا ہوا آٹا اور روٹی قرض لینے کے جواز کا فتویٰ۔

اور ان کے علاوہ دیگر وہ مسائل ہیں جن کا عرف پر مدار رکھا گیا ہے اور اشباہ میں ایسے بہت سے مسائل ذکر کئے گئے ہیں یہ سب وہ مسائل ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل گئے ہیں۔ اور احکام کی تبدیلی کی بنیاد یا ضرورت ہے یا عرف وعادت یا قرائن احوال اور یہ سب بدلے ہوئے احکام فقہ حنفی سے خارج نہیں ہیں کیونکہ صاحب مذہب اگر اس زمانہ میں ہوتے تو وہ بھی ضرور یہی کہتے اور اگر حالات کا یہ تغیر ان کے زمانہ میں رونما ہو چکا ہوتا تو وہ خود ان احکام کے خلاف تصریح نہ کرتے۔

اور یہی وہ بات ہے جس نے مجتہدین فی المذہب میں اور متاخرین میں سے صحیح نظر رکھنے والوں میں ظاہر روایت کی کتابوں میں صاحب مذہب کی طرف سے مصرح احکام کی مخالفت کی ہمت پیدا کی ہے کیونکہ صاحب مذہب نے ان احکام کا مدار اپنے زمانہ کے احوال پر رکھا ہے جیسا کہ کُلُّ حِلِّ عَلَیَّ حَرَامٌ میں فقہاء کی تصریح گزر چکی ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا مدار ان کے زمانہ کے عرف پر تھا اور فقہاء کی ایسی ہی تصریح ہم تعلیم قرآن پر اجارہ کے جواز کے مسئلہ میں بیان کر چکے ہیں۔

سوال:

پس اگر کوئی کہے کہ عرف تو بار بار بدلتا ہے تو کیا اگر دوسرا عرف پیدا ہو جائے جو زمانہ سابق میں نہیں تھا تو مفتی کے لیے مصرح احکام کی مخالفت اور نئے احکام کی پیروی جائز ہے؟

جواب:

میں کہتا ہوں جائز ہے کیونکہ وہ متاخرین جنہوں نے مذکورہ بالا مسائل میں مصرح احکام کی مخالفت کی ہے وہ امام صاحب کے زمانہ کے بعد نیا عرف پیدا ہونے کی وجہ ہی سے کی ہے۔

---

[1] حمام ہوٹلوں کے قبیل کے نہانے کا انتظام کا نام ہے۔ جہاں عام لوگ اجرت ادا کر کے نہاتے ہیں الحمام قد یکون عاما ید خله من شاء من الناس وقد یکون خاصاً فی البیت لا ید خله الا اهل البیت وعند الاطلاق یراد به الحمام العام. (معجم لغة الفقهاء ص۱۸۶)

لہٰذا عرفی الفاظ میں مفتی نئے عرف کی پیروی کرے گا اسی طرح ان احکام میں جن کا مدار مجتہد نے اپنے زمانہ کے عرف پر رکھا ہے اور وہ عرف بدل گیا ہے اور نیا عرف پیدا ہو گیا ہے تو مفتی انہیں حضرات کی پیروی میں نئے عرف کا اعتبار کرے گا۔

مفتی کا با بصیرت واقف عرف ہونا ضروری ہے:

لیکن یہ ضروری ہے کہ مفتی ذی رائے ہو درست فکر رکھتا ہو اور شریعت کے قواعد سے واقف ہو تاکہ معتبر عرف...... جس پر احکام کا مدار رکھنا درست ہے۔ اور غیر معتبر عرف میں امتیاز کر سکے کیونکہ متقدمین نے مفتی کے لیے اجتہاد کو شرط قرار دیا ہے اور یہ بات ہمارے زمانہ میں مفقود ہے اس لیے کم از کم یہ شرط تو ہونی ہی چاہیے کہ مفتی مسائل کو ان کی قیود و شروط کے ساتھ جانتا ہو کیونکہ فقہاء بارہا شرائط و قیود چھوڑ دیتے ہیں اور فقہ کے طالب علم کی سمجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصریح نہیں کرتے۔

اسی طرح مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا عرف جانتا ہو اور اہل زمانہ کے احوال سے واقف ہو اور اس سلسلہ میں اس نے کسی ماہر استاذ کے پاس رہ کر واقفیت حاصل کی ہو اور اسی وجہ سے منیۃ المفتی[1] کے آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر کسی شخص کو ہمارے ائمہ کی تمام کتابیں حفظ ہوں تو بھی فتویٰ دینے کے لیے شاگردی ضروری ہے تاکہ فتویٰ دینے کی راہ اس کی سمجھ میں آئے اس لیے کہ بہت سے مسائل میں اہل زمانہ کی اس عادت کے مطابق جو شریعت کے خلاف نہیں ہے جواب دیا جاتا ہے۔''

اور قنیہ (۳۳) میں ہے کہ:

> ''نہ مفتی کے لیے جائز نہ قاضی کے لیے کہ وہ ظاہر روایت کے مطابق فیصلہ کرے اور عرف کو چھوڑ دے۔''

قنیہ کی یہ عبارت خزانۃ الروایات[2] میں بھی نقل کی گئی ہے اور یہ عبارت اس بارے میں

---

[1] منیۃ المفتی علامہ یوسف بن ابی سعید احمد سجستانی نزیل سیواس (متوفی ۶۳۸ھ کے بعد) کی تصنیف ہے اور غیر مطبوعہ ہے (کشف الظنون ص ۱۸۸۷۔ ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۵۵۴)

[2] خزانۃ الروایات قاضی جکن حنفی گجراتی کی تصنیف ہے (کشف الظنون ج ۱ ص ۷۰۲)

صریح ہے جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مفتی اپنے زمانہ کے عرف کے خلاف فتویٰ نہیں دے گا۔

فتویٰ میں مصلحت کا لحاظ ضروری ہے:

اور اس سے قریب وہ عبارت ہے جو اشباہ میں فتاویٰ بزازیہ (۴۱) سے نقل کی گئی ہے کہ مفتی اس مصلحت کے مطابق فتویٰ دے جو اس کی سمجھ میں آئے اور میں نے رد المحتار باب القسامہ ج۵ ص۴۵۰) میں لکھا ہے کہ اس صورت میں جبکہ ولی مقتول جس محلہ میں لاش ملی ہے اس محلہ والوں کے علاوہ کسی آدمی پر قتل کا دعویٰ کرے اور محلہ والوں میں سے دو گواہ پیش کرے تو امام اعظمؒ کے نزدیک وہ گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور صاحبین کے نزدیک قبول کی جائے گی۔ (اس مسئلہ کی تفصیل کرنے کے بعد تنبیہ کا عنوان قائم کر کے علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ) علامہ حموی نے علامہ مقدسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> ''میں امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینے سے ٹھیرا رہا اور میں نے اس قول کی اشاعت نہیں ہونے دی۔ کیونکہ اس قول پر ضرر عام مرتب ہوتا ہے اس لیے کہ جو سرکش آدمی یہ قول جانتا ہے وہ لوگوں کو ایسے محلہ میں قتل کرے گا جہاں اس محلہ والوں کے سوا کوئی اور موجود نہ ہو کیونکہ اسے اطمینان ہو گا کہ محلہ والوں کی شہادت تو اس کے خلاف قبول نہیں ہو گی۔ اس لیے میں نے کہا کہ صاحبین کے قول پر فتویٰ مناسب ہے خاص طور پر جب کہ احکام زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے ہیں۔'' (رد المحتار کی عبارت پوری ہوئی)

مفتی کے لیے لوگوں کے احوال کا جاننا ضروری ہے:

اور فتح القدیر کی کتاب الصوم باب ما یوجب القضاء والکفارۃ (ج۲ ص۲۵۹) میں جہاں صاحب ہدایہ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص دانتوں کے درمیان پھنسا ہوا گوشت کھالے تو اگر وہ تھوڑا ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور زیادہ ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور امام زفر فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں ٹوٹ جائے گا.......... اور چنے کی مقدار قلیل و کثیر کے درمیان حد فاصل ہے.......... اور اگر اس گوشت کو باہر نکالا اور ہاتھ میں لے لیا پھر کھا گیا تو اس کا روزہ (بہر صورت) ٹوٹ جانا چاہیے.......... اور چنے کی مقدار میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قضا واجب ہے کفارہ واجب نہیں ہے اور امام زفرؒ کے نزدیک کفارہ بھی واجب ہے امام

زفر کی دلیل یہ ہے کہ وہ گوشت کا کھانا ہے اگر چہ وہ سڑا ہوا ہے اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ طبیعت اس کو کھانے سے گھن کرتی ہے (ہدایہ کی عبارت تمام ہوئی) اس مسئلہ کی شرح میں علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بعینہٖ پیش ہے۔

''اور تحقیقی بات یہ ہے کہ پیش آنے والے واقعات میں فتویٰ دینے والے میں ایک درجہ کی اجتہاد کی صلاحیت اور لوگوں کے احوال سے واقفیت ضروری ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ کفارہ کمال جنایت کا محتاج ہے۔ اس لیے مفتی صاحب واقعہ کے احوال میں غور کرے اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی طبیعت ایسا گوشت کھانے سے گھن کرتی ہے تو وہ امام ابو یوسفؒ کا قول لے اور اگر صاحب واقعہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے نزدیک ایسا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں تو وہ امام زفرؒ کے قول پر فتویٰ دے۔''

ایک سوال:

اور علامہ قاسم رحمہ اللہ کی تصحیح القدوری میں ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ علماء کبھی ترجیح دئے بغیر اقوال نقل کرتے ہیں اور کبھی ان حضرات میں تصحیح کے سلسلہ میں اختلاف ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب:

تو میں جواب دوں گا کہ مفتی وہی کرے جو علماء کرتے ہیں یعنی عرف اور لوگوں کے احوال کی تبدیلی کا اعتبار کرے اور اس قول کو لے جس میں لوگوں کے لیے نرمی ہے اور جس پر تعامل جاری ہے اور جس کی دلیل مضبوط ہے اور دنیا کبھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی جو ان باتوں میں واقعی امتیاز کر سکتے ہیں، محض خود فریبی نہیں اور جو امتیاز نہیں کر سکتا وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرے جو امتیاز کر سکتے ہیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے (علامہ قاسم کی عبارت پوری ہوئی)

عرف خلاف شرع نہ ہو تو فتویٰ میں اس کا لحاظ ضروری ہے:

الغرض یہ تمام عبارتیں اس بارے میں صریح ہیں جو ہم نے کہی ہے کہ عرف پر عمل ہو گا بشرطیکہ وہ عرف خلاف شریعت نہ ہو۔ جیسے ٹیکس چنگی، سود اور اس قسم کی دوسری چیزیں (اگر چہ

عام ہوگئی ہیں مگر وہ خلاف شرع ہیں) اسی لیے مفتی اور قاضی کے لیے بلکہ مجتہد کے لیے بھی لوگوں کے احوال کا جاننا ضروری ہے اور علماء نے فرمایا ہے کہ: جو شخص اہل زمانہ کو نہیں جانتا ہے وہ نادان ہے (مَنْ جَهِلَ بَاهْلِ زَمَانِه فَهُوَ جَاهِل) اور ہم پہلے علماء کا یہ قول بھی نقل کر آئے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق قضا سے ہے ان میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ ان کو واقعات کا تجربہ تھا اور وہ لوگوں کے حالات جانتے تھے۔

اور بحر میں امام محمد کردری رحمہ اللہ کی مناقب الامام الاعظم (۴۱) سے نقل کیا ہے کہ امام محمدؒ رنگریزوں کے پاس جایا کرتے تھے اور ان کے معاملات کے بارے میں اور ان کے آپس کے کاروبار کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کیا کرتے تھے اھ

اور علماء نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ:

''اگر زمین والا اپنی زمین میں عمدہ چیز کی کاشت کی قدرت کے باوجود معمولی چیز بوئے تو اس کے ذمہ اعلیٰ کاشت کا محصول واجب ہوگا۔''

علماء نے فرمایا کہ یہ مسئلہ صرف جاننا چاہیے اس پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے تاکہ ظالم حکام لوگوں کے اموال لینے میں بے باک نہ ہو جائیں۔ عنایہ شرح ہدایہ (ج ۵ ص ۲۸۵) علی ہامش الفتح) میں فرمایا ہے کہ اس بات کی یہ کہہ کر تردید کی گئی ہے کہ مسئلہ چھپانا کیسے جائز ہے؟ اور اگر حکام زائد محصول لیتے ہیں تو وہ لینے میں حق بجانب ہیں کیونکہ وہ واجب ہے۔ اس تردید کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ:

''اگر ہم یہ فتویٰ دیں گے تو ہر ظالم ایسی زمین کے بارے میں جو اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے یہ دعویٰ کرے گا کہ اس میں پہلے مثال کے طور پر زعفران کی کاشت ہوتی تھی اور وہ اس کا محصول مانگے گا اور یہ ظلم وزیادتی ہے۔ اھ

اور فتح القدیر (ج ۵ ص ۲۸۵) میں بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ:

''علماء نے فرمایا ہے کہ اس مسئلہ پر فتویٰ نہ دیا جائے کیونکہ یہ فتویٰ دینے کی صورت میں ظالم حکام مسلمانوں کے اموال پر مسلط ہو جائیں گے۔ ہر ظالم دعویٰ کرے گا کہ یہ زمین زعفران اور اس جیسی چیزوں کی کاشت کے قابل ہے اور اس کا علاج دشوار ہوگا۔ اھ''

الغرض آپ کے لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ مفتی یا قاضی کا منقول روایات کے ظاہر پر جما رہنا اور عرف اور واضح قرائن کو چھوڑ دینا اور لوگوں کے احوال سے ناواقف رہنا بہت سے حقوق ضائع کرنے اور بہت بڑی مخلوق پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

عرف عام، عرف خاص اور ان کے احکام:

پھر جانیں کہ عرف کی دو قسمیں ہیں۔ عرف عام اور عرف خاص۔ عرف عام سے عام حکم ثابت ہوتا ہے اور وہ قیاس وحدیث کے لیے مخصص بن سکتا ہے اور عرف خاص کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس سے حکم خاص ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ وہ قیاس یا حدیث کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ عرف خاص مخصص نہیں بن سکتا۔ ذخیرہ میں کتاب الاجارہ کی آٹھویں فصل میں جہاں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ اگر کسی نے کتا ہوا سوت کپڑا بننے والے کو دیا کہ وہ تیار کپڑے کا تہائی لے کر کپڑا بن دے وہاں صاحب ذخیرہ نے لکھا ہے کہ:

> ''بلخ کے فقہاء جیسے نصیر بن یحییٰ، محمد بن سلمہ اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات کپڑوں میں اس اجارہ کو جائز کہتے ہیں، ان کے علاقہ میں کپڑوں کی بنائی میں اس کا تعامل ہونے کی وجہ سے اور تعامل ایک ایسی حجت ہے کہ اس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور روایت میں تخصیص کر لی جاتی ہے۔''

اور کپڑوں کی بنائی میں تعامل کی وجہ سے اس اجارہ کو جائز قرار دینے کا مطلب اس حدیث میں تخصیص کرنا ہے جو قفیز طحان کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس لیے کہ وہ حدیث آٹا پیسنے والے کے پیمانہ کے بارے میں وارد ہوئی ہے کپڑا بننے والے کے بارے میں وارد نہیں ہوئی مگر کپڑا بننے والا اس کی نظیر ہے اس لیے وہ حدیث دلالۃً اس کے بارے میں بھی ہوگی پھر جب ہم نے کپڑا بننے والے کے حق میں اس حدیث پر عمل نہ کیا اور آٹا پیسنے والے کے پیمانے کے بارے میں اس حدیث پر عمل کیا تو یہ حدیث میں تخصیص ہوئی حدیث کو بالکل چھوڑنا نہ ہوا اور تعامل کی وجہ سے حدیث کی تخصیص جائز ہے۔ دیکھیے ہم تعامل کی وجہ سے استصناع کو جائز کہتے ہیں حالانکہ اس میں ایسی چیز کا بیچنا ہے جو بائع کے پاس نہیں ہے اور ایسی چیز کے بیچنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے اور تعامل کی وجہ سے استصناع کو جائز قرار دینا اس حدیث میں تخصیص کرنا ہے جو اس چیز کو بیچنے کی ممانعت کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو آدمی کے پاس نہیں ہے حدیث کو بالکل چھوڑ

نا نہیں ہے کیونکہ ہم استصناع کے علاوہ دیگر جزئیات میں اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔
علماء نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ یہ بات اس صورت سے بالکل مختلف ہے جب کسی علاقہ میں قفیز طحان ہی کا رواج ہو جائے تو وہ جائز نہ ہوگا اور ان لوگوں کا معاملہ معتبر نہ سمجھا جائے گا اس لیے کہ اگر ہم ان کے معاملہ کو معتبر مان لیں تو حدیث کو بالکلیہ چھوڑنا ہوگا اور تعامل کی وجہ سے حدیث کو چھوڑنا قطعاً جائز نہیں، صرف اس میں تخصیص جائز ہے۔
لیکن ہمارے علماء نے اس تخصیص کو (جو مشائخ بلخ نے کی ہے) جائز قرار نہیں دیا کیونکہ کپڑوں کی بنائی کا یہ معاملہ ایک خاص علاقہ کے لوگوں کا معاملہ ہے اور ایک علاقہ کے لوگوں کا تعامل حدیث میں تخصیص پیدا نہیں کرتا اس لیے کہ ایک علاقہ کے لوگوں کا تعامل اگر تخصیص کو چاہے گا تو دوسرے علاقہ میں اس کا عدم تعامل تخصیص کو روک دے گا۔ پس شک کی وجہ سے تخصیص ثابت نہ ہوگی اور استصناع کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہ تمام علاقوں کا تعامل ہے (ذخیرہ کی عبارت پوری ہوئی)

اور ذخیرہ کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جس صورت میں عرف عام کا اعتبار کرنے سے منصوص کو چھوڑنا لازم آتا ہو اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ عرف عام کا اعتبار صرف اس صورت میں کیا جائے گا کہ اس کا اعتبار کرنے سے نص میں تخصیص لازم آتی ہو۔ اور عرف خاص کا دونوں صورتوں میں اعتبار نہیں کیا جائے گا وہ صرف عرف والوں کے حق میں معتبر ہوگا بشرطیکہ اس کا اعتبار کرنے سے نہ تو نص کا چھوڑنا لازم آئے اور نہ اس میں تخصیص کرنی پڑے، اگرچہ وہ عرف خاص ظاہر روایت کے خلاف ہو (پھر بھی اس کا اعتبار کیا جائے گا) اور عرف خاص کا معتبر ہونا جیسے قسموں کے بارے میں متعارف الفاظ میں اور عقود یعنی بیع و اجارہ وغیرہ معاملات میں رائج عرف و عادت میں، چنانچہ وہ الفاظ و معاملات ہر علاقہ میں اس علاقہ کے عرف کے مطابق جاری ہوں گے اور ان سے وہی بات مراد لی جائے گی جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے اور وہی صحت و فساد اور جواز و عدم جواز مراد لیا جائے گا جو ان لوگوں کے عرف کا مقتضی ہے۔ اگرچہ فقہاء نے صراحت کی ہو کہ الفاظ و عقود کا مقتضی لوگوں کے عرف کے خلاف ہے۔ کیونکہ بولنے والا اپنے عرف و عادت کے مطابق ہی بولتا ہے اور اپنے کلام سے اسی کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ ان معانی کا اعتبار نہیں کرتا جو فقہاء مراد لیتے ہیں اور ہر شخص سے برتاؤ اس کی مراد کے مطابق کیا جاتا

ہے اور تمام عرفی الفاظ کے اصطلاحی مفاہیم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اصلی معنی مجاز لغوی کی طرح ہو جاتے ہیں۔ جامع الفصولین میں کہا ہے کہ:

''وہ کلام جو لوگوں میں آپس میں بولا جاتا ہے وہ متعارف معنی کی طرف پھیرا جاتا ہے''

اور علامہ قاسمؒ کے فتاویٰ میں ہے کہ:

''تحقیقی بات یہ ہے کہ وقف کرنے والے، وصیت کرنے والے، قسم کھانے والے، منت ماننے والے اور عقد کرنے والے کے الفاظ اس کی گفتگو میں اور اس کی زبان میں...... جسے وہ بولتا ہے...... اس کے عرف پر محمول کیے جائیں گے۔ عرب اور شارع کی لغت کے موافق ہوں یا نہ ہوں۔''

عرف کی بحث تشنہ ہے:

اخیر میں یہ عرض ہے کہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جس نے اس مسئلہ میں ایسی مفصل گفتگو کی ہو جو بیمار کو شفا بخشے مگر اس مسئلہ کی وضاحت مزید تفصیل کی محتاج ہے کیونکہ مسئلہ طویل الذیل ہے جزئیات اور اصول کے تذکرہ کا محتاج ہے اور ان سوالوں کا جواب دینے کی ضرورت ہے جو کسی کی طرف سے اٹھائے جا سکتے ہیں نیز ان مسائل کی وضاحت بھی ضروری ہے جن کا عرف پر مدار ہے مگر یہاں میں نے اسی قدر پر اکتفا کی ہے پھر بعض وہ باتیں جو میرے دل میں تھیں ان کو ایک مستقل رسالہ میں ظاہر کیا ہے جو اسی شعر کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے اور اس میں کچھ وہ باتیں بھی میں نے شامل کی ہیں جن کو بڑی مشقت سے میں نے نکالا ہے اور میں نے اس رسالہ کا نام نشر العرف (خوشبو پھیلانا) فی بناء بعض الاحکام علی العرف رکھا ہے (جو رسائل ابن عابدین میں ج ۲، ص ۱۱۴ سے شروع ہوتا ہے) جو شخص اس مسئلہ میں مزید تفصیل کا خواہش مند ہے وہ اس رسالہ کی طرف رجوع کرے۔

۷۰- وَلَا يَجُوْزُ بِالضَّعِيْفِ الْعَمَلُ　　وَلَا بِهٖ يُجَابُ مَنْ جَاءَ يَسْأَلُ

۷۱- اِلَّا لِعَامِلٍ لَهٗ ضَرُوْرَةٌ　　اَوْ مَنْ لَهٗ مَعْرِفَةٌ مَشْهُوْرَةٌ

۷۲- لٰكِنَّمَا الْقَاضِیْ بِهٖ لَايَقْضِیْ　　وَاِنْ قَضَا فَحُكْمُهٗ لَا يَمْضِیْ

۷۳- لَاسِيَّمَا قُضَاتُنَا اِذْ قُيِّدُوْا　　بِرَاجِحِ الْمَذْهَبِ حِيْنَ قُلِّدُوْا

۷۴۔ وَتَمَّ مَانَظَمْتُهٗ فِیْ سِلْکٖ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ خِتَامُ مِسْکٖ

ترجمہ: (۷۰)اور ضعیف قول پر عمل جائز نہیں ہے۔اور نہ ضعیف قول سے جواب دیا جائے گا۔ اس کو جو مسئلہ پوچھنے آیا ہے۔

(۷۱) مگر وہ عمل کرنے والا مستثنیٰ ہے جس کو مجبوری ہے۔ یا وہ مفتی جس کو مہارت تامہ حاصل ہے۔

(۷۲) البتہ قاضی ضعیف قول کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا۔اور اگر کرے گا تو وہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

(۷۳) خاص طور پر ہمارے زمانہ کے قاضی کیوں کہ وہ پابند کیے گئے ہیں۔ راجح مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کے جب ان کو عہدہ سونپا گیا ہے۔

(۷۴) اور پورے ہوئے وہ مضامین جو میں لڑی پر و رہا تھا۔اور الحمد للہ مشک کی مہر ہے۔

ہم اس شرح کے آغاز میں علامہ قاسم رحمہ اللہ کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ:

(۱) مرجوح قول کے مطابق فیصلہ کرنا یا فتویٰ دینا اجماع کے خلاف ہے۔

(۲) اور راجح قول کے مقابلہ میں مرجوح قول کالعدم ہے۔

(۳) اور متضاد روایات میں کسی مرجح کے بغیر ترجیح دینا ممنوع ہے۔

(۴) اور جو شخص بس اتنی بات پر اکتفاء کرتا ہے کہ اس کا فتویٰ یا اس کا عمل کسی بھی قول یا وجہ کے مطابق ہو جائے اور مختلف اقوال و وجوہ میں سے...... ترجیح میں غور و فکر کیے بغیر...... جس قول پر یا جس وجہ پر چاہتا ہے عمل کرتا ہے وہ یقیناً نادان ہے اور خرق اجماع کرتا ہے۔ (علامہ قاسم کی باتوں کا خلاصہ پورا ہوا۔)

اور پہلے وہیں ہم اسی طرح کی بات علامہ ابن حجرؒ (۵) کے فتاویٰ کے حوالہ سے بھی بیان کر چکے ہیں۔

ضعیف قول پر عمل اور فتویٰ:

لیکن علامہ کے فتاویٰ میں یہ بھی ہے کہ امام سبکی رحمہ اللہ (۱۱۶) نے اپنے فتاویٰ میں کتاب الوقف میں فرمایا ہے کہ:

''نفس الامر میں ضعیف وجہ کی پیروی کرنا اپنے ذاتی عمل کے تعلق سے جائز ہے اور فتویٰ میں اور فیصلہ میں جائز نہیں ہے کیونکہ علامہ ابن الصلاح (۷) نے اس کے عدم جواز پر اجماع نقل کیا ہے۔''

اور علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ (۴۶) نے اپنے رسالہ اَلعِقدُ الفَرِید فِیْ جَوازِ التقلِید میں فرمایا ہے کہ:

''مذہب شافعی کا مقتضیٰ ...... جیسا کہ علامہ سبکیؒ نے بیان کیا ہے۔ فیصلہ اور فتویٰ میں مرجوح قول پر عمل کا عدم جواز ہے اور اپنے ذاتی عمل کا یہ حکم نہیں ہے اور حنفیہ کا مذہب مرجوح قول پر عمل کا عدم جواز ہے' اپنی ذات کے لیے بھی' کیونکہ مرجوح قول منسوخ ہو گیا ہے۔''

شرنبلالی پر اعتراض:

میں کہتا ہوں کہ عدم جواز کی یہ وجہ بیان کرنا کہ مرجوح قول منسوخ ہو گیا ہے صرف اس صورت میں معقول ہے جب کسی مسئلہ میں مجتہد کے دو قول ہوں اور اس نے ایک قول سے رجوع کر لیا ہو یا ایک قول کا دوسرے سے مؤخر ہونا معلوم ہو' ورنہ معقول نہیں۔ مثلاً کسی مسئلہ میں ایک قول امام ابو یوسفؒ کا ہے اور دوسرا امام محمدؒ کا تو اس میں نسخ کی کوئی صورت نہیں بنتی۔

جواب:

لیکن علامہ شرنبلالی کی مراد یہ ہے کہ جب دو قولوں میں سے ایک قول کی تصحیح کی گئی ہو تو دوسرا قول بمنزلہ منسوخ ہو جائے گا (حقیقۃً منسوخ ہونا ان کی مراد نہیں ہے) اور علامہ قاسمؒ کی اس بات کا مطلب بھی یہی ہے جو گزر چکی ہے کہ: ''راجح قول کے مقابلہ میں مرجوح قول کالعدم ہے''

علامہ سبکی پر اعتراض:

پھر وہ بات جو علامہ سبکی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک اپنے ذاتی عمل کے تعلق سے مرجوح قول پر عمل کرنا جائز ہے یہ بات اس بات کے خلاف ہے جو علامہ قاسمؒ کے حوالہ سے گزر چکی ہے اور علامہ قاسمؒ کے قول جیسا قول ہم اس شرح کے آغاز میں ابن حجر رحمہ اللہ کے فتاویٰ کے حوالہ سے بھی بیان کر چکے ہیں۔ انہوں نے اجماع نقل کیا ہے کہ آدمی جس

قول پر بھی چاہے نہ تو فتویٰ دے سکتا ہے نہ عمل کرسکتا ہے۔

جواب:

ہاں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ عمل سے مراد قضا اور فیصلہ ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اور جواب دینے کی بہتر صورت یہ ہے کہ "تشھی" کی تعبیر سے جواب نکالا جائے اور یہ کہا جائے کہ اجماع مطلق تخییر کی ممانعت پر ہے یعنی آدمی مختلف اقوال میں سے جس وقت جس قول کو چاہے اختیار کرے اور من مانی کرے یہ ممنوع ہے لیکن اگر کوئی شخص کبھی کسی ضرورت کے تقاضے سے ضعیف قول پر عمل کرے تو وہ ممنوع نہیں ہے۔

بوقت ضرورت احناف کے نزدیک بھی ضعیف قول پر عمل جائز ہے:

اور اسی پر اس قول کو محمول کیا جائے گا جو پہلے شرنبلالی کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ حنفیہ کا مذہب عدم جواز کا ہے (یعنی یہ عدم جواز تشہی کی صورت میں ہے ضرورت کے وقت جائز ہے) اس دلیل سے کہ فقہاء نے مسافر کو اور اس مہمان کو جو شبہ سے ڈرتا ہے اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص خواب دیکھے اور جب اسے بد خوابی کا احساس ہو تو عضو کو مضبوط پکڑ لے اور جب شہوت ست پڑ جائے تو چھوڑ دے تو اس پر غسل واجب نہیں ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک غسل واجب ہونے کے لیے منی کا شہوت کے ساتھ عضو سے نکلنا شرط ہے۔ حالانکہ امام ابو یوسفؒ کا یہ قول فقہ حنفی میں راجح قول کے خلاف ہے مگر علماء نے بوقت ضرورت اس پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے۔

اور اسی قبیل سے وہ مسئلہ بھی ہونا چاہیے جو صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب مختارات النوازل میں ذکر فرمایا ہے یہ ایک مشہور کتاب ہے جس سے ہدایہ کے شارحین وغیرہ مسائل نقل کرتے ہیں آپ نے فصل النجاسہ میں لکھا ہے کہ:

"جب خون تھوڑا تھوڑا زخم سے نکلے، جو بہنے والا نہ ہو، تو وہ ناقض وضوء نہیں چاہے اس کی مجموعی مقدار بہت ہو اور ایک ضعیف قول یہ ہے کہ اگر وہ خون اتنا ہو کہ اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور بہے تو وہ ناقض ہے۔"

پھر صاحب ہدایہ نے یہ مسئلہ نواقض وضو میں دوبارہ بیان کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"اگر زخم سے تھوڑی چیز نکلے اور اس کو کسی کپڑے سے پونچھ لے اور مجموعی مقدار

اتنی ہو کہ اگر وہ چیز چھوڑ دی جاتی تو بہہ جاتی تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور ایک ضعیف قول یہ ہے کہ............"

اور میں نے کتاب کا ایک اور نسخہ بھی دیکھا اس میں بھی عبارت بعینہ اسی طرح ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مذہب کی عام کتابوں میں مشہور قول دوسرا ہی ہے جس کو قیل سے بیان کیا گیا ہے اور وہ پہلا قول جس کو صاحب ہدایہ نے پسند کیا ہے، میری معلومات کی حد تک، کسی نے ان سے پہلے اس کو اختیار نہیں کیا ہے اور نہ ان کے بعد کسی نے ان کی ہم نوائی کی ہے۔ یہ بات میں بہت سی کتابوں کی مراجعت کے بعد کہہ رہا ہوں لہذا وہ قول شاذ ہے۔ مگر صاحب ہدایہ فقہ حنفی کے اکابرین میں سے جلیل القدر امام ہیں اور اصحاب تخریج و تصحیح کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس معذور شخص کے لیے ضرورت کے وقت اس قول میں صاحب ہدایہ کی تقلید جائز ہے کیونکہ اس قول میں معذوروں کے لیے بڑی گنجائش ہے جس کی تفصیل میں نے الاَحکامُ المَخصَّصَة بکَیِّ الحِمَّصَه[1] نامی رسالہ میں کی ہے۔

اور خود مجھے عرصے تک فالحِمَّصَۃ میں مبتلا رہنا پڑا ہے اور اس قول کے علاوہ میری سمجھ میں کوئی دوسری صورت نہیں آتی تھی جس کی رو سے ہمارے مذہب کے مطابق بلا مشقت میری نماز درست ہو جائے اس لیے کہ زخم سے نکلنے والی رطوبت اگرچہ تھوڑی ہوتی تھی مگر اس کی مجموعی مقدار اتنی ہوتی تھی کہ اگر وہ چھوڑ دی جاتی تو ضرور بہہ جاتی اور مشہور قول کے مطابق ایسی رطوبت ناپاک اور ناقض وضو ہے۔ اس میں بعض حضرات کا اختلاف بھی ہے جو میں نے اپنے مذکورہ رسالہ میں بیان کیا ہے۔

اور اس قسم کی رطوبت کی وجہ سے آدمی صاحب عذر نہیں ہوتا کیونکہ اس کو روکنا ممکن ہے اس طرح کہ ہر نماز کے وقت جگہ کو دھولیا جائے اور چمڑے وغیرہ سے کس کر مضبوط باندھ لیا جائے تو وہ بہاؤ کو روک دے گا اور میں ایسا ہی کرتا تھا مگر اس میں دشواری اور بہت تنگی تھی۔ اس

---

[1] یہ رسالہ رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۵۴ میں الفوائد المخصصہ کے نام سے ہے کَیّ کے معنی ہیں لوہے سے داغنا اور حِمَّصَۃ کے معنی ہیں چنا کی الحِمَّصَۃ ایک طریقہ علاج تھا جسم کے کسی حصہ کو کسی بیماری کی وجہ سے داغتے تھے داغنے کی وجہ سے وہاں زخم ہو جاتا تھا اور رطوبت رستی تھی تو اس پر چنے کا دانہ رکھ کر پٹی باندھ دیتے تھے وہ چنا زخم سے نکلنے والی رطوبت چوس لیتا تھا۔ ۱۲

لیے میں نے مجبوراً اس قول کی پیروی کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا بخشی تو میں نے بیماری کے زمانہ کی تمام نمازوں کا اعادہ کیا وللہ الحمد!

اور البحر الرائق کے مصنف نے باب الحیض (ج۱ ص۱۵۳) میں حیض کے رنگوں کی بحث میں چند ضعیف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''معراج الدرایہ میں فخر الائمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مفتی ضرورت کی جگہوں میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ان اقوال میں سے کسی قول پر فتویٰ دے تو یہ اچھی بات ہوگی۔''

اور اس قول سے یہ بات معلوم ہوئی کہ:

(۱) مجبور آدمی اپنے ذاتی عمل کے معاملہ میں ضعیف قول پر عمل کر سکتا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔

(۲) اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مفتی مجبور شخص کو ضعیف قول کے مطابق فتویٰ بھی دے سکتا ہے۔

پس جو بات اوپر گزر چکی ہے کہ ضعیف قول پر آدمی کے لیے عمل بھی جائز نہیں ہے اور اس پر فتویٰ دینا بھی جائز نہیں ہے وہ بات محل ضرورت کے علاوہ پر محمول ہے جیسا کہ مجموعی بحث سے یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

ملحق بالضرورۃ:

اور ضرورت کے ساتھ اس بات کو بھی لاحق کرنا مناسب ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کسی ایسے مسلمان کے کفر کا فتویٰ نہیں دینا چاہیے کہ اس بات کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اگرچہ ضعیف روایت کی رو سے وہ اختلاف پیدا ہوا ہو کیونکہ علماء نے کفر کے معاملہ میں ضعیف روایت کی موجودگی میں صحیح قول پر فتویٰ دینے سے عدول کیا ہے اس لیے کہ کفر نہایت سنگین بات ہے۔

بیری کی بات اور اس کی تاویل:

اور علامہ بیری رحمہ اللہ کی شرح اشباہ میں ہے کہ: (سوال) کیا انسان کے لیے اپنی ذات کے معاملہ میں ضعیف روایت پر عمل کرنا جائز ہے؟

جواب:

یہ ہے کہ جائز ہے بشرطیکہ وہ شخص ذی رائے ہو(یعنی مجتہد فی المذہب ہو) اور اگر وہ شخص عام آدمی ہو(جس میں غیر مجتہد مفتی بھی داخل ہے) تو اس کا حکم میں نے نہیں دیکھا مگر جواز کو ذی رائے کی قید کے ساتھ مقید کرنے کا مقتضیٰ یہ ہے کہ عام آدمی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے خزانۃ الروایات میں لکھا ہے کہ:

''وہ عالم جو کہ نصوص اور احادیث کے معانی جانتا ہے اور فہم وفراست رکھنے والوں میں سے ہے' تو اس کے لیے ضعیف روایت پر عمل کرنا جائز ہے اگر چہ وہ روایت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔'' (بیری کی بات پوری ہوئی)

اور جواز کو ذی رائے یعنی مجتہد فی المذہب کی قید کے ساتھ مقید کرنا عام آدمی کو نکال دیتا ہے جیسا کہ بیری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کیونکہ اس پر اس قول کی پیروی لازم ہے جس کی علماء نے تصحیح کی ہے۔ مگر یہ بات ضرورت کی جگہ کے علاوہ میں ہے جیسا کہ ابھی آپ اس کو جان چکے ہیں۔

ایک سخت تعارض کا اشکال:

پھر اگر کوئی کہے کہ یہ بات اس بات کے خلاف ہے جس کو آپ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مجتہد مفتی کے لیے بھی اس قول سے عدول جائز نہیں ہے جس پر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ متفق ہوں۔ مفتی کے لیے ایسے قول کے خلاف فتویٰ دینا جائز نہیں ہے اگر چہ وہ مفتی مجتہد اور ماہر ہو کیونکہ وہ ائمہ تمام دلائل جانتے تھے اور صحیح ثابت اور غیر صحیح دلائل کے درمیان انہوں نے امتیاز کر لیا تھا اور اس مفتی کا اجتہاد ان اکابر کے اجتہاد کو نہیں پہنچ سکتا جیسا کہ ہم خانیہ وغیرہ کے حوالہ سے یہ بات پہلے بیان کر آئے ہیں۔

مفصل جواب:

تو میں جواب دوں گا کہ وہ بات اس شخص کے حق میں ہے جو دوسروں کو فتویٰ دیتا ہے (وہ اگر مجتہد بھی ہو تب بھی اس کے لیے ائمہ ثلاثہ کے متفقہ مسلک سے عدول جائز نہیں ہے) اور اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) شاید یہ وجہ ہو کہ جب وہ مفتی جانتا ہے کہ ان اکابر کا اجتہاد زیادہ قوی ہے تو اس کے

لیے جائز نہیں ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے سوالات کا اپنے کمزور ترین اجتہاد پر مدار رکھے۔

(۲) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ سائل اس مفتی کے پاس اس امام کا مذہب معلوم کرنے آیا ہے جس کی وہ مفتی تقلید کرتا ہے اس لیے اس مفتی پر لازم ہے کہ وہ اس مذہب کے مطابق فتویٰ دے جس کو دریافت کرنے کے لیے وہ مستفتی آیا ہے۔

اور اسی لزوم کی وجہ سے علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ ان سے ایسے واقف کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے اپنے لیے وقف میں تغیر و تبدل کرنے کی شرط رکھی تھی پھر اس نے وہ وقف اپنی بیوی کے نام کر دیا تو علامہ قاسمؒ نے جواب دیا کہ:

''ہمارے علماء کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے کہ ایسا کرنا درست ہے اور مفتی کو بس اتنا ہی حق ہے کہ وہ اہل مذہب کے نزدیک جن کے قول پر وہ فتویٰ دیتا ہے۔ جو بات ثابت ہو اس کو نقل کر دے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مستفتی اسی بات کو دریافت کرتا ہے جو اس مذہب کے ائمہ کی رائے ہے وہ مفتی کے لیے جو بات واضح ہو اس کو دریافت نہیں کرتا۔''

اور علماء نے اسی قسم کی بات شافعی امام قفال رحمہ اللہ کے بارے میں نقل کی ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس اناج کے ڈھیر کو فروخت کرنے کا مسئلہ دریافت کرنے آتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ: ''میرا مذہب معلوم کرنا چاہتا ہے یا امام شافعیؒ کا؟'' ....اور اسی طرح علماء نے قفال ہی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ کبھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں خود اجتہاد کروں اور میرا اجتہاد امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے موافق ہو جائے تو میں سائل سے یہ کہوں گا کہ امام شافعیؒ کا مذہب تو یہ ہے مگر میں امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کا قائل ہوں کیونکہ وہ شخص امام شافعیؒ کا مذہب جاننے اور دریافت کرنے آیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ میں اس کے علم میں یہ بات لے آؤں کہ میں امام شافعیؒ کے قول کے علاوہ قول پر فتویٰ دیتا ہوں۔

اور رہا ضعیف قول پر عمل کرنے کا معاملہ تو بظاہر یہ بات اس (مجتہد مفتی) کے لیے جائز ہے اور اس کی دلیل خزانۃ الروایات کا یہ قول ہے کہ:

''آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ ضعیف روایت پر عمل کرے اگرچہ وہ روایت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔''

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجتہد کے ذمہ اسی بات کی پیروی لازم ہے جس تک اس کا اجتہاد پہنچ گیا ہے چنانچہ محقق ابن الہمامؒ کو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے ایسے کئی مسائل کو ترجیح دی ہے جو فقہ حنفی سے خارج ہیں اور ایک جگہ تو انہوں نے ایک مسئلہ میں امام مالک رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور فرمایا ہے کہ: ''یہی وہ قول ہے جس کو میں مذہب بناتا ہوں۔''

اور ہم پہلے تحریر کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ جو شخص بعض مسائل میں مجتہد ہے.....اجتہاد میں تجزی کے جواز کے قول کی بنا پر جو کہ برحق قول ہے۔اس کے ذمہ ان مسائل میں تقلید لازم ہے جن میں وہ اجتہاد پر قادر نہیں اور جن مسائل میں وہ مجتہد ہے ان میں تقلید لازم نہیں ہے۔

ضعیف قول پر یا مذہب غیر پر فیصلہ جائز نہیں:

میں نے شعر نمبر۲۷ میں کہا ہے کہ قاضی اپنے مذہب کے ضعیف قول پر فیصلہ نہیں کر سکتا اسی طرح کسی اور امام کے مذہب پر بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ علامہ قاسم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابو العباس احمد بن ادریس قرافی مالکی رحمہ اللہ (۹) نے فرمایا ہے کہ:

''کیا حاکم (قاضی) پر واجب ہے کہ وہ اپنے نزدیک جو راجح قول ہو بس اسی کے مطابق فیصلہ کرے جیسا کہ مفتی پر واجب ہے کہ اپنے نزدیک جو قول راجح ہے اسی کے مطابق فتویٰ دے یا حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ دو قولوں میں سے کسی ایک قول پر فیصلہ کرے اگرچہ وہ قول اس کے نزدیک راجح نہ ہو؟.........اس کا جواب یہ ہے کہ حاکم اگر مجتہد ہے تو اس کے لیے فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔مگر اسی قول کے مطابق جو اس کے نزدیک راجح ہے اور اگر وہ مقلد ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے مذہب کے مشہور قول کے مطابق فتویٰ دے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے اگرچہ وہ قول اس کے نزدیک راجح نہ ہو۔محکوم بہ[۱] (یعنی حکم) کی ترجیح میں اپنے اس امام کی پیروی کرتے ہوئے جس کی وہ تقلید کرتا ہے جیسا

---

[۱] محکوم بہ سے مراد وہ حکم ہے جو قاضی سناتا ہے۔ والمحکوم به هو الذی الزمه الحاکم (قواعد الفقہ ص۴۷۲) اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غیر مجتہد حاکم (قاضی) فتویٰ دینے میں تقلید کرتا ہے حکم کرنے میں بھی تقلید کرے گا کیونکہ دونوں ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں ۱۲

کہ وہ فتویٰ میں اس امام کی تقلید کرتا ہے۔ اور فتویٰ اور فیصلہ میں خواہش کی پیروی کرنا بالاجماع حرام ہے اسی طرح مرجوح قول کے مطابق فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا بھی اجماع کے خلاف ہے۔''

اور البحر الرائق (ج ۷ ص ۹) میں ذکر کیا ہے کہ اگر کسی مختلف فیہ مسئلہ میں قاضی اپنا مذہب بھول کر اپنی رائے کے خلاف فیصلہ کر دے تو وہ امام اعظمؒ کے نزدیک نافذ ہو جائے گا۔ اور بالقصد فیصلہ کرنے کی صورت میں دو روایتیں ہیں اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں نافذ نہیں ہوگا.......... اور ترجیح میں اختلاف ہے فتاویٰ خانیہ میں ہے کہ امام صاحب کی دو روایتوں میں سے اظہر روایت فیصلہ کا نفاذ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور ایسا ہی فتاویٰ صغریٰ میں ہے۔

اور معراج الدرایہ میں محیط کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے اور ایسا ہی ہدایہ میں ہے اور فتح القدیر (ج ۶ ص ۳۹۷) میں ہے کہ:

''فتویٰ کے سلسلہ میں فقہاء میں اختلاف ہے اور اس زمانہ میں زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جائے کیونکہ جو قاضی بالقصد اپنا مذہب چھوڑتا ہے وہ ناروا خواہش ہی کی وجہ سے چھوڑتا ہے، کسی اچھے مقصد سے نہیں چھوڑتا اور رہا بھولنے والا تو عہدہ سونپنے والے سلطان نے اس کو اسی لیے عہدہ سپرد کیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے، مذہب غیر کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔ یہ ساری تفصیل مجتہد قاضی کے بارے میں ہے۔ اب رہا مقلد قاضی تو بادشاہ نے اس کو اسی لیے عہدہ سونپا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے موافق فیصلہ کرے اس لیے وہ مخالفت کا اختیار نہیں رکھتا۔ پس وہ اس حکم کے تعلق سے معزول سمجھا جائے گا'' (فتح اور بحر دونوں کی عبارتیں پوری ہوئیں)

پھر ابن نجیم رحمہ اللہ نے مقلد قاضی کے سلسلہ میں مشائخ کی مختلف عبارتیں ذکر کی ہیں اور جس پہلو پر ان کی گفتگو فروکش ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قاضی مذہب غیر پر یا ضعیف روایت پر یا ضعیف قول پر فیصلہ کرے گا تو وہ نافذ ہوگا اور ان کی اس سلسلہ میں سب سے مضبوط دلیل وہ عبارت ہے جو فتاویٰ بزازیہ میں شرح طحاوی سے منقول ہے کہ:

''جب قاضی مجتہد نہ ہو اور کسی مفتی کے فتویٰ پر فیصلہ کر دے پھر یہ بات ظاہر ہو کہ وہ فیصلہ اس کے مذہب کے خلاف تھا تو وہ نافذ ہو جائے گا اور کسی اور کو اس کے توڑنے کا حق نہیں ہے اور وہ خود اس فیصلہ کو توڑ سکتا ہے امام محمد رحمہ اللہ سے ایسا ہی مروی ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ خود بھی اس کو نہیں توڑ سکتا۔''

لیکن قنیہ میں محیط وغیرہ سے جو بات منقول ہے وہ یہ ہے کہ:

''روایتوں میں اختلاف مجتہد قاضی کے بارے میں ہے جب وہ اپنی رائے کے خلاف فیصلہ کرے اور مقلد قاضی جب اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ کرے تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔''

اور محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں اور ان کے تلمیذ علامہ قاسم رحمہ اللہ نے تصحیح القدوری میں قطعیت سے یہی رائے بیان کی ہے اور النہر الفائق میں کہا ہے کہ:

''فتح القدیر میں جو بات ہے اس پر مذہب میں اعتماد کرنا واجب ہے اور جو بات فتاویٰ بزازیہ میں ہے وہ اس پر محمول ہے کہ وہ صاحبین کی روایتیں ہیں۔ پس غایت الامر[1] یہ ہے کہ یہ قاضی اپنا مذہب بھولنے والے قاضی کی جگہ میں اتارا ہوا ہے اور پہلے مجتہد قاضی کے بارے میں صاحبین کا یہ قول گزر چکا ہے کہ اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔ پس مقلد قاضی کا فیصلہ بدرجہ اولیٰ نافذ نہ ہوگا۔''

اور در مختار (ج ۱ ص ۵۶) میں فرمایا ہے کہ:

''میں کہتا ہوں کہ خاص طور پر ہمارے زمانہ میں' کیونکہ بادشاہ اپنے منشور میں صراحۃً قاضی کو ضعیف اقوال پر فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دیتا ہے پس وہ اپنے مذہب کے خلاف کیسے فیصلہ کر سکتا ہے؟ وہ اپنے مذہب کے غیر معتمد اقوال کے تعلق سے معزول سمجھا جائے گا۔ اس لیے اس کا فیصلہ اس بارے میں نافذ نہ ہوگا اور وہ فیصلہ توڑ دیا جائے گا جیسا کہ فتح' بحر' نہر وغیرہ کتابوں میں قضا کی بحث میں اس مسئلہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔''

---

[1] یہاں متن میں صحیح لفظ (اذ قصارى الامر) ہے دیکھیے شامی ج ۴ ص ۳۷۳۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ آپ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ مرجوح قول راجح قول کے مقابلہ میں کالعدم ہے اس لیے قاضی مرجوح قول پر فیصلہ نہیں کر سکتا اگر چہ سلطان نے اپنے منشور میں راجح قول پر فیصلہ کرنے کی صراحت نہ کی ہو اور علامہ قاسم رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے کہ:

> ''مقلد قاضی کے لیے ضعیف قول پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اہل ترجیح میں سے نہیں ہے۔ پس وہ صحیح قول سے عدول کسی نامناسب مقصد ہی کے لیے کرے گا اور اگر کوئی قاضی فیصلہ کر دے تو وہ نافذ نہ ہوگا کیونکہ اس کا وہ فیصلہ ناحق فیصلہ ہے کیوں کہ حق صحیح قول ہی ہے...... اور وہ بات جو منقول ہے کہ ضعیف قول فیصلہ کی وجہ سے قوی ہو جاتا ہے تو اس سے مراد مجتہد کا فیصلہ ہے جیسا کہ اس کی وضاحت اپنی جگہ میں کی گئی ہے۔ یہ جواب اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔''

اور علامہ قاسم رحمہ اللہ نے مذکور قول کا جو مطلب بیان کیا ہے اس کی ان کے استاذ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں صراحت کی ہے۔

خاتمہ

اللہ علیم وخبیر کی مدد سے عقود رسم المفتی کی تقریر، توضیح اور تحریر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی ذات کے لیے خالص اور روز محشر کامیابی کا ذریعہ بنائیں اور جن خطاؤں اور گناہوں کا میں نے ارتکاب کیا ہے ان سے درگزر فرمائیں فَاِنَّهُ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَعَالٰى اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

یہ تحریر اس کے جامع فقیر محمد عابدین کے قلم سے پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ، اس کی اس کے والدین کی، اس کے اساتذہ کی، اس کی اولاد کی اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائیں (آمین)

اور یہ اختتام ماہ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ میں ہوا۔

اور اس کا ترجمہ تصنیف سے ۱۶۹ سال بعد ۲۹/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ میں عاجز سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری خادم دار العلوم دیوبند کے قلم سے اور نور چشم مولوی مفتی رشید احمد سلمہ، متعلم دار الافتاء دار العلوم دیوبند کے تعاون سے پورا ہوا اللہ تعالیٰ ترجمہ کو بھی اصل کی طرح قبول فرمائیں اور ذخیرہ آخرت بنائیں (آمین یارب العالمین)

اور اس کی تبییض ۲۱/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ کو لخت جگر مفتی رشید احمد پالن پوری قدس سرہ کی وفات سے تقریباً ساڑھے پانچ ماہ بعد مکمل ہوئی۔ آنعزیز کی وفات کا حادثہ ۶-۷ مارچ ۱۹۹۵ء مطابق ۴-۵ شوال ۱۴۱۵ھ پیر منگل کی درمیانی رات میں پیش آیا جس کی تفصیل مقدمہ میں ہے۔

فَرَحِمَهُ اللّٰهِ رَحْمَةً وَّاسِعَةً وَّاَسْكَنَه فَسِيْحَ جِنَانِه وَاَجْزَلَ عَلَيْهِ رِضْوَانَه وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِه سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِه وَصَحْبِه اَجْمَعِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

☆ ☆ ☆

حواشی

(نوٹ: حواشی میں جہاں کسی کتاب کے بعد لفظ ''مخطوطہ'' آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے اور اس کا مخطوطہ کسی کتب خانہ میں موجود ہے۔)

۱- امام علی بن ابی بکر' ابو الحسن' برہان الدین' فرغانی' مرغینانی (مرغلانی) رحمہ اللہ (ولادت ۵۳۰ھ وفات ۵۹۳ھ) چھٹی صدی کے بڑے حنفی فقیہ ہیں۔ مشہور درسی کتاب ہدایہ اور اس کا متن ہدایہ آپ ہی کی تصنیفات ہیں۔ دیگر تصنیفات یہ ہیں (۱) مختارات النوازل (اس کے مخطوطے جامعہ ازہر مصر اور جامعہ ریاض میں ہیں) (۲) التجنیس والمزید (یہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے' اس کا مخطوطہ موجود ہے) (۳) مناسک الحج (۴) منتقی الفروع (جزئیات فقہیہ کا مجموعہ) (۵) کتاب الفرائض (۶) کفایۃ المنتہی (یہ بدایۃ المبتدی کی مطول شرح تھی۔ اسی جلدوں میں مکمل ہوئی تھی۔ ہدایہ اسی کی تلخیص ہے)

۲- علامہ اکمل الدین محمد بن محمد رومی بابرتی رحمہ اللہ (ولادت ۷۱۴ھ وفات ۷۸۶ھ) آٹھویں صدی کے بلند پایہ حنفی فقیہ ہیں۔ بابرتی وطنی نسبت ہے۔ سید شریف جرجانیؒ کے استاذ ہیں۔ کتب فقہ میں اکمل اور الاکمل سے آپ ہی مراد ہوتے ہیں۔ وفات قاہرہ میں ہوئی ہے۔ آپ کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح عنایہ ہے جو ہدایہ کو حل کرنے کے لیے بہترین شرح ہے۔ فتح القدیر کے حاشیہ پر چھپی ہے دوسری کتابیں یہ ہیں۔ (۱) شرح مشارق الانوار (۲) التقریر علی اصول البزدوی (۳) شرح وصیۃ الامام ابی حنیفہ (۴) شرح المنار (۵) الارشاد فی شرح الفقہ الاکبر (۶) خلاطی کی تلخیص الجامع الکبیر کی شرح وغیرہ (شامی ج ۱' ص ۲۰۔ اعلام ج ۷' ص ۴۲)

۳- تاج الشریعہ محمود بن صدر الشریعۃ الاکبر احمد بن جمال الدین عبید اللہ محبوبی بخاری رحمہ اللہ (سن وفات معلوم نہیں ساتویں صدی کے ہیں) آپ نے فقہ کا متن وقایۃ الروایہ فی مسائل الہدایہ اپنے پوتے صدر الشریعۃ الاصغر عبید اللہ بن مسعود کے حفظ کرنے کے لیے لکھا ہے اور اس میں ہدایہ کے مسائل کا خلاصہ کیا ہے پوتے نے اس کی شرح لکھی ہے جو شرح وقایہ کے

نام سے مشہور ہے نیز پوتے نے وقایہ کا اختصار بھی کیا ہے جو نقایہ (عمدہ خلاصہ) کہلاتا ہے اس کی شرح قہستانی نے جامع الرموز لکھی ہے جو مطبوعہ ہے (۲۹) ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بھی اس کی شرح لکھی ہے جو شرح نقایہ کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ اس خاندان کا نسب حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے حضرت عبادہؓ کے پوتے کا نام محبوب تھا' محبوبی اس کی طرف نسبت ہے۔ صدر الشریعۃ الاصغر کی وفات ۷۴۷ھ میں ہوئی ہے۔

۴- ابو حنیفہ' قوام الدین' امیر کاتب بن امیر عمر بن امیر غازی اتقانی فارابی رحمہ اللہ (و ۶۸۵ھ ف ۷۵۸ھ) اتقان جائے پیدائش ہے جو فاراب کے پاس ہے۔ وفات قاہرہ میں ہوئی ہے و کان کثیر الاعجاب بنفسہ' شدید التعصب لمذھبہ (اعلام ج ۲' ص ۱۴) آپ کی کتاب غایۃ البیان ونادرۃ الاقران چھ جلدوں میں مخطوطہ ہے۔

۵- شیخ الاسلام' شہاب الدین احمد بن محمد بن علی' علامہ ابن حجر ھَیتَمی اور ہیثمی مکی رحمہ اللہ (و ۹۰۹ھ ف ۹۷۳ھ) جلیل القدر شافعی فقیہ ہیں۔ ولادت مصر میں ابوالہیتم نامی محلہ میں ہوئی تھی اس لیے ہیتمی سے مشہور ہوئے وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے اس لیے مکی بھی کہلاتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (و ۷۷۳ھ ف ۸۵۲ھ) صاحب فتح الباری کی وفات سے تقریباً نصف صدی کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کی ذات سے بھی حافظ ابن حجر کی طرح امت کو بہت فیض پہنچا ہے۔ آپ کا فتاویٰ کبریٰ جو فتاویٰ ہیتمیہ سے بھی مشہور ہے چار جلدوں میں مطبوعہ ہے آپ کثیر التصانیف ہیں اور آپ کی بہت سی تصانیف مطبوعہ ہیں (اعلام ج ۱' ص ۲۳۴)

۶- روضۃ الطالبین وعمدۃ المتقین فقہ شافعی میں امام نووی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۶ھ) کی مشہور کتاب ہے جو صرف ''روضہ'' سے بھی معروف ہے اور زوائد الروضہ سے مراد غالبًا ابن قاضی عجلون ابو الفضل محمد بن عبداللہ دمشقی (و ۸۳۱ھ ف ۸۷۶ھ) کی التاج فی زوائد الروضۃ علی المنهاج ہے جو ابھی تک مخطوط ہے۔

۷- علامہ ابو عمرو بن الصلاح عثمان بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ (و ۵۷۷ھ ف ۶۴۳ھ) مشہور شافعی فقیہ اور بڑے محدث ہیں۔ اصول حدیث میں آپ کی کتاب مقدمہ ابن الصلاح داخل درس ہے۔ آپ کے فتاویٰ مطبوعہ ہیں اور آپ کا رسالہ ادب المفتی والمستفتی نایاب ہے۔

۸- علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی قرطبی رحمہ اللہ (و ۴۰۳ھ ف ۴۷۴ھ) مشہور

مالکی فقیہ اور محدث ہیں۔ اندلس کا باجہ مقام جائے پیدائش ہے اور المریۃ میں وفات ہوئی آپ کی مشہور کتاب موطا امام مالک کی شرح المنتقی مطبوعہ ہے۔

۹- علامہ قرافی ابو العباس احمد بن ادریس رحمہ اللہ (متوفی ۶۸۴ھ) مشہور مالکی فقیہ اور ماہر اصولی ہیں۔ مصر میں محلہ قرافہ میں آپ کی ولادت ہوئی تھی اور مصر ہی میں وفات ہوئی ہے۔ آپ کی مشہور کتاب انوار البروق فی انواء الفروق چار جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ آپ کی دوسری کتاب الاحکام فی تمییز الفتاویٰ عن الاحکام و تصرف القاضی و الامام بھی مطبوعہ ہے۔

۱۰- علامہ قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ (و ۸۰۲ھ ف ۸۷۹ھ) نویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور بڑے محدث ہیں۔ ولادت و وفات قاہرہ میں ہوئی ہے۔ علامہ ابن الہمام کے خاص تلمیذ ہیں اور کثیر التصانیف ہیں۔ چند یہ ہیں (۱) تاج التراجم (علمائے احناف کے حالات میں مختصر کتاب) مطبوعہ ہے (۲) موجبات الاحکام و واقعات الایام (مطبوعہ) (۳) فتاویٰ (مخطوطہ) (۴) التصحیح والترجیح للقدوری (غیر مطبوعہ)

۱۱- علامہ ابن سید الناس یعمری ابو الفتح محمد بن محمد رحمہ اللہ (و ۶۷۱ھ ف ۷۳۴ھ) آٹھویں صدی کے بڑے محدث اور شافعی فقیہ ہیں۔ سید الناس آپ کے سلسلہ نسب میں کسی دادا کا نام ہے۔ اصل وطن اشبیلیہ ہے مگر ولادت اور وفات قاہرہ میں ہوئی ہے۔ سیرت میں آپ کی مشہور کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر دو جلدوں میں مطبوعہ ہے نیز اس کا اختصار نور العیون بھی مطبوعہ ہے اور ترمذی شریف کی شرح النفح الشذی نامکمل اور غیر مطبوعہ ہے۔

۱۲- قاضی شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا رحمہ اللہ (متوفی ۹۴۰ھ) مشہور حنفی فقیہ محدث اور کثیر التصانیف عالم ہیں۔ آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ قلما یوجد فن من الفنون ولیس لابن کمال باشا مصنف فیہ (اعلام) مگر مطبوعہ صرف چند رسائل کا مجموعہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ۳۶ رسالے ہیں اور غیر مطبوعہ کتابوں میں سے چند یہ ہیں (۱) طبقات الفقہاء (۲) طبقات المجتہدین (۳) الاصلاح والایضاح (فقہ حنفی میں متن اور شرح) (۴) تغییر التنقیح (اصول فقہ کا متن ہے پھر خود ہی اس کی شرح لکھی

ہے)(۵) ہدایہ کا حاشیہ آپ ابن کمال اور ابن الکمال سے مشہور ہیں۔

۱۳- ائمہ اربعہ یہ ہیں (۱) امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمہ اللہ ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ (۲) امام مالک بن انس مدنی رحمہ اللہ ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ (۳) امام محمد بن ادریس شافعی ہاشمی، مکی رحمہ اللہ ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ (۴) امام احمد بن محمد بن حنبل بغدادی رحمہ اللہ ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ۔

۱۴- امام ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم انصاری، کوفی، بغدادی رحمہ اللہ (و ۱۱۳ھ ف ۱۸۲ھ) امام اعظمؒ کے سب سے بڑے شاگرد اور امام محمدؒ کے استاذ ہیں۔ عباسی خلفاء مہدی، ہادی اور ہارون رشید کے زمانہ میں قاضی رہے۔ قاضی القضاۃ کا خطاب سب سے پہلے آپ کو دیا گیا۔ آپ کی مطبوعہ کتابیں یہ ہیں (۱) کتاب الخراج (۲) کتاب الآثار (۳) کتاب الرد علی سیر الاوزاعی غیر مطبوعہ کتابیں متعدد ہیں جیسے مبسوط امالی وغیرہ۔

۱۵- امام ابوعبداللہ محمد بن الحسن شیبانی رحمہ اللہ (و ۱۳۱ھ ف ۱۸۹ھ) امام اعظم کے خاص تلمیذ اور ان کے علوم کے جامع اور ناشر ہیں۔ امام اعظمؒ کی وفات کے بعد امام ابو یوسف سے تعلیم مکمل کی آپ کی مطبوعہ کتابیں یہ ہیں (۱) کتاب الاصل (مبسوط)(۲) جامع کبیر (۳) جامع صغیر (۴) زیادات (۵) زیادات الزیادات (۶) کتاب الآثار (۷) شرح السیر الکبیر للسرخسی (اصل کتاب طبع نہیں ہوئی)(۸) کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ (۹) موطا محمد (۱۰) کتاب الامالی۔ غیر مطبوعہ کتابیں بھی متعدد ہیں۔

۱۶- امام ابوبکر خصاف (موچی) احمد بن عمر شیبانی رحمہ اللہ (متوفی ۲۶۱ھ) جلیل القدر حنفی فقیہ ہیں قاضی خان فرماتے ہیں والخصاف کان کبیراً فی العلم، یجوز الاقتداء به (شامی ج ۲، ص ۲۹۵) آپ کی دو کتابیں مطبوعہ ہیں ایک احکام الاوقاف دوسری کتاب الحیل اور ادب القاضی مخطوطہ ہے باقی کتابیں مفقود ہیں۔

۱۷- امام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی، طحاوی رحمہ اللہ (و ۲۳۹ھ ف ۳۲۱ھ) مشہور حنفی فقیہ اور بڑے محدث ہیں۔ مصر کے طحا مقام میں پیدا ہوئے۔ امام شافعی کے تلمیذ رشید امام مزنی رحمہ اللہ کے بھانجے تھے آپ کی مطبوعہ کتابیں یہ ہیں (۱) شرح معانی الآثار (طحاوی شریف) (۲) بیان مشکل الآثار (اس کتاب کا چوتھائی حصہ پانچ جلدوں میں طبع ہوا

ہے (۳) مختصر الطحاوی (فقہ حنفی کا متن ہے۔ بہت سے علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں) اور غیر مطبوعہ کتابیں بہت ہیں۔

۱۸- امام ابوالحسن کرخی عبید اللہ بن حسین رحمہ اللہ (و ۲۶۰ھ ف ۳۴۰ھ) مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ امام طحاوی اور امام خصاف کے معاصر ہیں۔ کرخ جائے ولادت ہے وفات بغداد میں ہوئی ہے۔ آپ کی مطبوعہ کتاب صرف اصول الکرخی ہے۔ اس میں وہ اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جن پر فقہ حنفی کی جزئیات کا مدار ہے۔ آپ نے جامع صغیر اور جامع کبیر کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

۱۹- شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد بخاری حلوانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۴۸ھ) پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں حلویٰ (مٹھائی) کی طرف نسبت ہے اس لیے حلوائی (نون کے بجائے ہمزہ) سے بھی بولا جاتا ہے۔ آپ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ کے استاذ ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کوئی کتاب نہیں۔ غیر مطبوعہ یہ ہیں (۱) مبسوط (۲) فتاویٰ (۳) امام ابو یوسفؒ کی ادب القاضی کی شرح۔

۲۰- ابوبکر شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۸۳ھ) پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ حلوائی رحمہ اللہ (۱۹) کے تلمیذ رشید ہیں آپ کی مشہور کتاب مبسوط تیس جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ علاوہ ازیں سیر کبیر کی شرح چار جلدوں میں، اصول سرخسی اور نکت شرح زیادات الزیادات بھی مطبوعہ ہیں اور غیر مطبوعہ میں شرح جامع کبیر اور شرح مختصر الطحاوی ہیں۔

۲۱- ابوالعسر فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی رحمہ اللہ (و ۴۰۰ھ ف ۴۸۲ھ) پانچویں صدی کے مشہور اصولی اور فقیہ ہیں بزدہ کی طرف (جو نسف کے قریب ایک قلعہ ہے) نسبت ہے۔ اصول فقہ میں آپ کی کتاب اصول بزدوی مطبوعہ ہے اس کا اصل نام کنز الوصول ہے آپ نے ایک مبسوط بھی لکھی ہے جو ہنوز مخطوطہ ہے۔

نوٹ: آپ کے بڑے بھائی صدر الاسلام ابوالیسر محمد بن محمد بزدوی رحمہ اللہ (متوفی ۴۹۳ھ) بھی بہت بڑے حنفی فقیہ ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے **کان امام الائمة علی الاطلاق، ملأ بتصانیفه بطون الاوراق** (فوائد بہیہ ص ۷۷) مگر آپ کی کوئی کتاب مطبوعہ نہیں ہے۔ دونوں بھائیوں کا سبق دقت و

سہولت میں بالکل مختلف تھا۔ بڑے بھائی کا انداز بیان شستہ، سلیس اور واضح تھا اس لیے وہ ابو الیسر کہلاتے تھے اور چھوٹے بھائی کا دقیق تھا اس لیے طلبہ ان کو ابو العسر کہتے تھے۔

۲۲ - علامہ فخر الدین قاضی حسن بن منصور اوز جندی، فرغانی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۲ھ) چھٹی صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں آپ کا فتاویٰ قاضی خان جس کو خانیہ بھی کہتے ہیں فتاویٰ عالم گیری کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے اور غیر مطبوعہ کتابیں یہ ہیں (۱) امالی (۲) شرح زیادات (۳) شرح جامع صغیر (۴) خصاف کی ادب القاضی کی شرح۔ اوز جند فرغانہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔

۲۳ - امام ابوبکر جصاص احمد بن علی رازی رحمہ اللہ (و ۳۰۵ھ ف ۳۷۰ھ) مشہور حنفی فقیہ اور مفسر اور اصولی عالم ہیں آپ کی مشہور کتاب احکام القرآن پانچ جلدوں میں مطبوعہ ہے اصول فقہ میں بھی آپ کی ایک وقیع تصنیف ہے۔ جو ابھی تک مخطوطہ ہے۔

۲۴ - امام قدوری، ابو الحسین احمد بن محمد رحمہ اللہ (و ۳۶۴ھ ف ۴۲۸ھ) چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں آپ کی مشہور بابرکت کتاب مختصر القدوری مطبوعہ درسی کتاب ہے۔ خلافیات میں بھی آپ کی ایک کتاب التجرید ہے جو مخطوطہ ہے۔

۲۵ - متون کا بیان۔ متون، متن کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں ریڑھ کی ہڈی اور اصطلاح میں متن ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن کو فن میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ فقہ حنفی میں بہت سے متون لکھے گئے ہیں۔ جب تک متاخرین کے متون وجود میں نہیں آئے تھے متقدمین کی کتابیں متون کہلاتی تھیں مثلاً امام طحاوی، کرخی، خصاف، جصاص رازی اور حاکم شہید کی مرتب کردہ فقہی کتابیں متون سے متعارف تھیں۔ بعد میں جب متاخرین نے متون مرتب کیے تو بعض لوگ متون ثلاثہ یعنی کنز، قدوری اور وقایہ کو اہمیت دیتے تھے اور اکثر متاخرین متون اربعہ یعنی کنز، وقایہ مختار اور مجمع البحرین کو ترجیح دیتے ہیں۔ متون کا تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) مختصر القدروری امام ابو الحسین قدوری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے (۲۴)

(۲) کنز الدقائق امام ابو البرکات عبد اللہ بن احمد حافظ الدین نسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ اس متن میں مصنف نے اپنی کتاب الوافی کی تلخیص کی ہے۔ البحر الرائق اور النہر الفائق اس کی مشہور شرحیں ہیں۔

(۳) وقایہ تاج الشریعہ کی تصنیف ہے (۳)

(۴) مختار جس کا پورا نام المختار للفتویٰ ہے۔ علامہ مجد الدین ابو الفضل عبداللہ بن محمود بن مودود موصلی رحمہ اللہ (و ۵۹۹ھ ف ۶۸۳ھ) کی تصنیف ہے۔ موصل آپ کی جائے ولادت ہے۔ کوفہ میں قاضی رہے آخر میں بغداد میں مدرس ہوئے۔ اور وہیں وفات پائی آپ نے اپنے متن کی خود ہی الاختیار لتعالیل المختار کے نام سے شرح لکھی ہے جو مطبوعہ ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے لکھا ہے کہ "ہما کتابان معتبران عند الفقہاء" شارح منیہ علامہ ابن امیر حاج حلبی نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ علامہ قاسم بن قطلو بغا نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اور بھی متعدد حضرات نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

(۵) **مجمع البحرین و ملتقی النهرین (یا ملتقی النیرین)** علامہ مظفر الدین ابن الساعاتی احمد بن علی بغدادی رحمہ اللہ (متوفی ۶۹۴ھ) کا مشہور متن متین ہے (۱۰۳) اس متن میں قدوری اور منظومۃ الخلافیات کے مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ اس لیے مجمع البحرین نام رکھا ہے یہ منظومہ عقائد نسفیہ کے مصنف مفتی الثقلین علامہ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد نسفی رحمہ اللہ (و ۴۶۱ھ ف ۵۳۷ھ) کا ہے اس منظومہ کی مبسوط شرح مصنف کنز علامہ حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی نے المستصفی نام سے لکھی ہے پھر اس کا اختصار المصفی کے نام سے کیا ہے۔

مجمع البحرین کی خود مصنف نے دو جلدوں میں شرح لکھی ہے۔ دیگر حضرات نے بھی شرحیں لکھی ہیں۔ چونکہ مجمع البحرین میں قدوری کے سب مسائل آ گئے ہیں اس لیے متاخرین نے متون اربعہ میں قدوری کو شامل نہیں کیا۔

(۶) **بداية المبتدی** یہ ہدایہ کا متن ہے اور خود صاحب ہدایہ کی تصنیف ہے۔ (۱)

(۷) **ملتقی الابحر** (دریاؤں کا سنگم) کبیر کے مصنف علامہ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم حلبی رحمہ اللہ (۴۰) (متوفی ۹۵۶ھ) کا مرقومہ متن ہے۔ اس متن میں قدوری، مختار، کنز اور وقایہ کے مسائل کو جمع کیا گیا ہے اور **مجمع البحرین** اور ہدایہ سے ضروری مسائل بھی بڑھائے ہیں۔ یہ متن مطبوعہ ہے۔ شیخ زادہ یا شیخی زادہ علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن سلیمان رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۷۸ھ) نے جو داماد کے لقب سے مشہور ہیں دو جلدوں میں مجمع الانہر کے نام سے اس متن کی شرح لکھی ہے جو مطبوعہ ہے۔ درمختار کے مصنف علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ نے

بھی اس کی شرح لکھی ہے جس کا مشہور نام الدر المنتقی ہے اور دوسرا نام سکب الانہر ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ دارالعلوم دیو بند میں ہے۔

(۸) تحفۃ الفقہاء علامہ علاء الدین محمد بن احمد سمر قندی رحمہ اللہ (متوفی ۵۴۰ھ) کا مشہور متن ہے اس کی علامہ کا شانی یا کاسانی ابو بکر بن مسعود رحمہ اللہ (متوفی ۵۸۷ھ) نے بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع کے نام سے شرح لکھی ہے جو سات جلدوں میں مطبوعہ ہے۔

(۹) غرر الاحکام ملا خسرو محمد بن فراموز بن علی رحمہ اللہ (متوفی ۸۸۵ھ) کا مشہور متن ہے۔ خود مصنف نے درر الحکام فی شرح غرر الاحکام کے نام سے شرح لکھی ہے جو دو جلدوں میں مطبوعہ ہے۔

(۱۰) درر البحار۔ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف قونوی رحمہ اللہ (و ۷۱۵ھ ف ۷۸۸ھ) کا متن ہے جو ابھی تک مخطوطہ ہے۔

(۱۱) تنویر الابصار و جامع البحار، خطیب تمرتاشی علامہ شمس الدین محمد بن عبداللہ غزی رحمہ اللہ (و ۹۳۹ھ ف ۱۰۰۴ھ) کا معروف متن ہے۔ خود مصنف نے منح الغفار کے نام سے شرح لکھی ہے جو ابھی مخطوطہ ہے۔ اسی متن کی علامہ علاء الدین محمد بن علی حصکفی رحمہ اللہ (و ۱۰۲۵ھ ف ۱۰۸۸ھ) نے دو شرحیں لکھی ہیں۔ مبسوط شرح کا نام خزائن الاسرار و بدائع الافکار فی تنویر الابصار و جامع البحار ہے معلوم نہیں یہ شرح مکمل ہوئی تھی یا نا تمام رہ گئی تھی دوسری شرح الدر المختار شرح تنویر الابصار ہے جو فتاویٰ کی معروف کتاب ہے اور جس پر علامہ شامی کا حاشیہ رد المحتار الی الدر المختار ہے جو حاشیہ شامی کے نام سے معروف ہے۔

۴۲۔مولانا ابو الحسنات محمد عبدالحی بن محمد عبدالحلیم انصاری لکھنوی رحمہ اللہ (و ۱۲۶۴ھ ف ۱۳۰۴ھ) مشہور حنفی فقیہ، محدث اور کثیر التصانیف عالم ہیں آپ کی بہت سی کتابیں مطبوعہ ہیں چند یہ ہیں۔(۱) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ (اس کتاب میں کفوی کی طبقات کی تلخیص کی ہے اور اس پر قیمتی اضافے کیے ہیں) (۲) الآثار المرفوعہ فی الاحادیث الموضوعہ (۳) الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل (۴) ظفر الامانی شرح مختصر الجرجانی (۵) عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ (۶) الساعیہ شرح شرح وقایہ (نا تمام) (۷) نفع المفتی والسائل بجمع متفرقات المسائل (۸) التعلیق الممجد علی موطا امام محمد (۹) حاشیہ ہدایہ (کامل) (۱۰) مجموعۃ الفتاویٰ وغیرہ بہت سی

کتابیں مطبوعہ ہیں۔

۲۷- حضرت الاستاذ مفتی سید مہدی حسن صاحب قادری شاہ جہاں پوری رحمہ اللہ (و ۱۳۰۱ھ ف ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ) فقہ حنفی میں غیر معمولی مہارت، حدیث شریف سے مناسبت تامہ، اسمائے رجال پر گہری نظر اور رجال احناف کے حافظ تھے۔ ۱۳۶۷ھ میں دارالعلوم دیو بند کے صدر مفتی ہوئے ۱۳۸۷ھ میں طویل علالت کی وجہ سے فرض منصبی سے سبکدوش ہو کر وطن شاہ جہاں پور تشریف لے گئے۔ اور وہیں وفات پائی۔ آپ کی چند تصانیف یہ ہیں (۱) قلائد الازہار علیٰ کتاب الآثار (امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار کی مبسوط شرح ہے اس کی تین جلدیں طبع ہو چکی ہیں باقی مسودہ بوسیدہ ہو گیا) (۲) شرح کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینہ (چار جلدوں میں مکمل شرح طبع ہو چکی ہے) (۳) اللآلی المصنوعہ من الاقوال المرجوعۃ عن الامام ابی حنیفۃ (مختصر عربی رسالہ ہے موضوع نام سے ظاہر ہے اور مطبوعہ ہے) علاوہ ازیں اردو میں دو درجن سے زائد کتابیں آپ نے تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے اکثر ایک بار طبع ہو کر نایاب ہو چکی ہیں (تاریخ دارالعلوم ج ۲، ص ۲۵۷)

۲۸- فتاویٰ خیریہ علامہ خیر الدین بن احمد بن علی ایوبی علیمی فاروقی رملی رحمہ اللہ (و ۹۹۳ھ ف ۱۰۸۱ھ) کا دو جلدوں میں مجموعہ فتاویٰ ہے اور مطبوعہ ہے۔ آپ کے صاحبزادے محی الدین بن خیر الدین (متوفی ۱۰۷۱ھ) نے اس کو جمع کرنا شروع کیا تھا مگر مکمل ہونے سے پہلے وفات ہو گئی تو شیخ ابراہیم بن سلیمان جینینی رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۰۸ھ) نے اس کو مکمل کیا ہے۔ رملہ فلسطین کا مشہور شہر ہے۔ وہیں آپ کی ولادت و وفات ہوئی ہے۔ آپ نے البحر الرائق پر بھی مظہر الحقائق کے نام سے حاشیہ لکھا ہے جو ابھی تک مخطوطہ ہے۔ علامہ شامی منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق میں بکثرت اس سے نقل کرتے ہیں اور الاشباہ والنظائر پر بھی آپ کا مختصر حاشیہ نزہۃ النواظر نامی ہے جو حموی کی شرح کے آخر میں جلد چہارم کے ص ۳۴۵ سے شروع ہوا ہے۔ (اعلام ج ۲، ص ۳۲۷)

۲۹- قہستانی علامہ شمس الدین محمد (متوفی ۹۵۳ھ) بخاریٰ کے مفتی تھے آپ نے نقایہ کی شرح جامع الرموز (۳) کے نام سے لکھی ہے جو مطبوعہ ہے۔ عرب لفظ قہستانی قاف اور ہاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور عجم قہستانی قاف کے ضمہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

کیونکہ اصل فارسی کلمہ کوہستان (پہاڑی علاقہ) ہے۔

۳۰- علائیؒ علامہ علائیؒ علامہ **حصکفی، حصکفی اور حصنی،** صاحب درمختار سے مراد علامہ علاء الدین محمد بن علی حصکفی رحمہ اللہ (و ۱۰۲۵ھ ف ۱۰۸۸ھ) ہیں گیارھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں، دمشق کے مفتی تھے۔ آپ کی معروف کتاب الدر المختار فی شرح تنویر الابصار ہے، جس پر علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے رد المحتار کے نام سے حاشیہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری کتابیں یہ ہیں افاضۃ الانوار علی اصول المنار (علامہ شامی نے اس پر بھی حاشیہ لکھا ہے جو طبع ہو چکا ہے) الدر المنتقی شرح ملتقی الابحر (۲۵) (مخطوطہ ہے)

نوٹ: (۱) علائی علاء الدین کی طرف نسبت ہے۔ صرف مضاف کو لے کر نسبت کی گئی ہے **حصکفی،** حِصن کیفا (کیفا نامی قلعہ) کی طرف نسبت ہے اور صرف مضاف کو لے کر **حصفی** بھی کہا جاتا ہے حصن کیفا آپ کا وطن ہے۔ مگر لوگ عام طور پر حا پر زبر بولتے ہیں۔

(۲) الدر المختار مرکب توصیفی ہے جس کے معنی ہیں "منتخب موتی" پس درمختار صحیح ہے کیونکہ یہ فارسی کی ترکیب توصیفی ہے اور الدر المختار بھی صحیح ہے یہ عربی میں مرکب توصیفی ہے مگر درالمختار غلط ہے کیونکہ یہ مرکب اضافی ہو گیا جو درست نہیں۔

(۳) رد المحتار مرکب اضافی ہے اور (اسم مفعول) بمعنی حیران ہے۔ شامی رحمہ اللہ نے وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **قدار شدت من احتار من الطلاب فی فهم معانی هذا الکتاب فلهذا سمیتها ردالمحتار علی الدرالمختار** (ج ۱ ص ۳) فرماتے ہیں: چونکہ میں نے اس حاشیہ میں اس کتاب (درمختار) کی مراد سمجھنے میں حیران طلبہ کی راہ نمائی کی ہے اس لیے میں نے اس کا نام رد المحتار علی الدر المختار رکھا ہے۔ اب پورا نام اس طرح ہے رد المحتار علی الدر المختار فی تنویر الابصار یعنی حیران کو پھیرنا منتخب موتی کی طرف جو آنکھوں کو روشن کرنے والا ہے، یعنی ایک شخص کا قیمتی موتی گم ہو گیا جو نور بصر ہے وہ اس کی تلاش میں حیران و پریشان ہے علامہ شامی نے اس کی راہ نمائی کی کہ دیکھ تیرا مطلوب یہ ہے۔ پس جو لوگ رد المختار (خاء کے ساتھ) بولتے یا لکھتے ہیں وہ نادان ہیں۔

۳۱- ابن نجیم، علامہ زین الدین بن ابراہیم مصری رحمہ اللہ (متوفی ۹۷۰ھ) دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں، شہرت ابن نجیم مصری اور زین بن نجیم سے ہے۔ تصانیف یہ ہیں (۱) کنز

الدقائق کی شرح البحر الرائق (صاف سمندر) آٹھ جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ کتاب الاجارہ باب الاجارۃ الفاسدۃ تک آپ کے قلم سے ہے۔ یہ باب مکمل نہیں ہوا تھا کہ وقت موعود آ پہنچا تکملہ شیخ محمد بن حسین طوری قادری (متوفی ۱۱۳۸ھ کے بعد) نے لکھا ہے۔ آٹھویں جلد تکملہ ہے (۲) فتاویٰ زینیہ (۳) مجموعہ رسائل زینیہ (۴۱ رسالوں کا مجموعہ ہے) (۴) الاشباہ والنظائر (سات فنون پر مشتمل ہے جو یہ ہیں۔ (۱) قواعد کلیہ (۲) ضوابط عامہ' (۳) فن جمع وفرق' (۴) الغاز (فقہی چیستانیں) (۵) حیل (فقہی تدابیر) (۶) اشباہ ونظائر اور (۷) حکایات کتاب کا نام جزء کے نام سے رکھا ہے اس کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔ رملی (۲۸) نے حاشیہ لکھا ہے اس کی معروف شرحیں تین ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) التحقیق الباہر شرح الاشباہ والنظائر از علامہ تاج الدین محمد ہبۃ اللہ بن محمد بعلی تاجی' دمشقی (و۱۱۵۱ھ ف ۱۲۲۴ھ) اس کا مخطوطہ تین جلدوں میں موجود ہے۔ علامہ شامی نے رسم المفتی میں اس سے عبارتیں نقل کی ہیں۔

(۲) غمز عیون البصائر فی شرح الاشباہ والنظائر از علامہ احمد بن محمد' ابو العباس شہاب الدین حموی مصری رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۹۸ھ) یہ ''شرح حموی'' سے بھی معروف ہے۔ چار جلدوں میں مطبوعہ اور متداول ہے۔ حموی کثیر التصانیف ہیں۔ اعلام ج ۱ ص ۲۳۹ میں ان کی بہت سی کتابوں کا تذکرہ ہے۔

(۳) عمدۃ ذوی البصائر لحل مبہمات الاشباہ والنظائر از علامہ بیری ابراہیم بن حسین حنفی مفتی مکہ مکرمہ (و۱۰۲۳ھ ف ۱۰۹۹ھ) استنبول میں اس کا مخطوطہ ہے۔ علامہ شامی رسم المفتی میں اس سے بکثرت نقل کرتے ہیں۔

۳۲۔ منلا مسکین معین الدین ہروی رحمہ اللہ (متوفی ۹۵۴ھ) آپ نے کنز کی شرح لکھی ہے جو شرح منلا مسکین کے نام سے مطبوعہ ہے۔ منلا کے نون کا لام میں ادغام کر کے ملا بھی کہتے ہیں۔ یہ ترکی لفظ ہے جو علامہ کا مترادف ہے۔

۳۳۔ علامہ زاہدی' مختار بن محمود' ابو الرجاء' نجم الدین رحمہ اللہ (متوفی ۶۵۸ھ) ساتویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ کان من کبار الائمۃ' واعیان الفقہاء' عالما کاملا' لہ الید الباسطۃ فی الخلاف والمذہب' والباع الطویل فی الکلام والمناظرۃ (فوائد بہیہ ص ۸۸) مگر علامہ ابن وہبان کے

خیال میں معتزلی عقیدہ کے تھے صرف فروع میں حنفی تھے۔ اس لیے جب تک دوسری کتابوں سے ان کی باتوں کی مطابقت نہ ہو جائے ان کی سب کتابیں غیر معتبر ہیں۔ ان کی کتابیں رطب و یابس کا مجموعہ بھی ہیں (فوائد بہیہ) مولی برکلی (۳۷) کہتے ہیں کہ تمام غیر معتبر کتابوں میں سر فہرست قنیہ ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے اپنی کتابوں میں قنیہ سے نقل کیا ہے مگر وہ علماء کے نزدیک ضعیف روایتوں میں مشہور ہے اور اس کا مصنف معتزلی ہے (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۵۷)

آپ کی تصانیف یہ ہیں (۱) قنیۃ المنیۃ لتتمیم الغنیہ (صرف قنیہ سے مشہور ہے) مطبوعہ ہے اور منیۃ الفقہاء کا خلاصہ ہے جو آپ کے استاذ علامہ بدیع بن منصور عراقی کی تصنیف ہے (۲) قدوری کی شرح مجتبیٰ جو ہنوز مخطوطہ ہے۔ (۳) زاد الائمہ وغیرہ۔

۳۴- علامہ عمر بن ابراہیم سراج الدین ابن نجیم مصری رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۰۵ھ) مشہور حنفی فقیہ اور ابن نجیم (۳۱) صاحب بحر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ عمر بن نجیم سے مشہور ہیں آپ نے کنز الدقائق کی شرح النہر الفائق لکھی ہے جو ہنوز مخطوطہ ہے۔ یہ شرح مکمل نہیں ہے۔ کتاب القضاء فصل الحبس تک ہے۔ پھر کوئی مانع پیش آ گیا جس کی وجہ سے تکمیل نہ کر سکے (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۱۷) آپ کی ایک کتاب اجابۃ السائل بھی ہے جس میں طرطوسی (۵۰) کی انفع الوسائل کی تلخیص کی ہے یہ بھی مخطوطہ ہے۔

۳۵- علامہ عینی بدر الدین محمود بن احمد رحمہ اللہ (و ۷۶۲ھ ف ۸۵۵ھ) مشہور حنفی فقیہ اور بہت بڑے محدث اور مؤرخ ہیں۔ آپ کی بخاری شریف کی بے مثال شرح عمدۃ القاری اور ہدایہ کی شرح البنایہ معروف مطبوعہ کتابیں ہیں آپ نے کنز کی بھی شرح لکھی ہے جس کا نام رمز الحقائق ہے۔ مگر یہ تینوں کتابیں آپ کے نام سے بھی معروف ہیں۔ اول عینی شرح بخاری ثانی عینی شرح ہدایہ ثالث عینی شرح کنز کہلاتی ہے۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔

۳۶- شیخ صالح بن ابراہیم جینینی حنفی رحمہ اللہ (و ۱۰۹۴ھ ف ۱۱۷۱ھ) مشہور حنفی عالم ہیں۔ جینین فلسطین میں ایک مقام ہے۔ بڑے محدث بھی ہیں اور بعلی (۳۱) کے استاذ ہیں۔

۳۷- علامہ محی الدین محمد بن پیر علی برکلی (برکوی) رومی رحمہ اللہ (و ۹۲۹ھ ف ۹۸۱ھ) مشہور نحوی صرفی حنفی فقیہ اور محدث ہیں آپ کی فقہی تصنیفات یہ ہیں (۱) شرح وقایہ کا حاشیہ (۲) ذخیرۃ المتاہلین والنساء فی تعریف الاطہار والدماء (۳) رسالۃ فی حرمۃ التغنی (۴) السیف الصارم علی

عدم جواز وقف المنقول والدراہم (باقی کتابوں کے نام ہدیۃ العارفین ج ۲، ص ۲۵۲ اور اعلام ج ۶، ص ۶۱ میں دیکھیں۔)

۳۸۔ السراج الوہاج الموضح لکل طالب ومحتاج آٹھ جلدوں میں قدوری کی شرح ہے اور مخطوطہ ہے۔ مصنف علامہ حداد (لوہار) ابوبکر بن علی الحداد الزبیدی رحمہ اللہ (متوفی ۸۰۰ھ) ہیں پھر آپ نے اس کی دو جلدوں میں تلخیص کی ہے جس کا نام الجوہرۃ النیرہ ہے جو مطبوعہ ہے۔ آپ کا تعلق یمن کے علاقہ عبادیہ سے تھا، وفات یمن کے مشہور قصبہ زبید میں ہوئی ہے۔ علامہ حدادی اور علامہ الحداد سے آپ مشہور ہیں۔ آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ لہ فی مذہب ابی حنیفۃ مصنفات جلیلۃ لم یصنف احد من العلماء الحنفیۃ بالیمن مثلہا، کثرۃ وافادۃ (اعلام ج ۲، ص ۶۷)

۳۹۔ علامہ ابن الہمام (ہمام: بہادر سخی سردار) کمال الدین محمد بن عبدالواحد سیواسی، اسکندری رحمہ اللہ (و ۷۹۰ھ ف ۸۶۱ھ) نویں صدی کے مشہور حنفی امام، مذاہب اربعہ کے اصولوں کے ماہر علم کلام کے شناور اور علوم عقلیہ کے جامع تھے۔ سیواس آبائی وطن ہے جو ترکیا میں ہے، ولادت اسکندریہ میں اور وفات قاہرہ میں ہوئی ہے علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ فقہ میں آپ کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ (شامی ج ۲، ص ۳۸۸) آپ کی سب کتابیں مطبوعہ ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) فتح القدیر للعاجز الفقیر (محتاج و عاجز بندے پر رب قدیر کی کشائش) ہدایہ کی معروف شرح ہے مگر مکمل نہیں کر سکے تھے کہ وقت موعود آ پہنچا۔ کتاب الوکالہ شروع کی تھی پر علامہ شمس الدین احمد بن قودر معروف بہ قاضی زادہ (متوفی ۹۸۸ھ) نے تکمیل کی۔ علامہ ابن الہمام نے قاری الہدایہ علامہ سراج الدین عمر بن علی کنانی (متوفی ۸۲۹ھ) سے انیس سال ہدایہ تحقیق واتقان کے ساتھ پڑھی ہے۔ پھر استاذ کے بعد خود پڑھانی شروع کی اور ساتھ ہی شرح بھی لکھنی شروع کی۔ ملا علی قاریؒ کا فتح القدیر پر دو جلدوں میں حاشیہ بھی ہے جو غیر مطبوعہ ہے (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۴) (۲) التحریر بین اصولی الشافعیۃ والحنفیۃ (شافعی اور حنفی اصول فقہ کے درمیان جمع وتہذیب) یہ نہایت دقیق کتاب ہے، اس کی دو شرحیں مطبوعہ ہیں۔ پہلی شرح تین جلدوں میں التقریر والتحبیر نامی ہے جو علامہ ابن امیر حاج (متوفی ۸۷۹ھ) کی ہے (۴۷) رسم المفتی میں بکثرت اس سے نقول ہیں دوسری شرح چار جلدوں میں تیسیر التحریر کے نام سے ہے۔

یہ علامہ محمد امین معروف بہ امیر بادشاہ (متوفی ۹۷۲ھ) کی ہے (۳) المسایرہ فی العقائد المنجیۃ فی الآخرۃ یہ علم کلام کا متن متین ہے۔ مسایرہ کے معنی ہیں ساتھ ساتھ چلنا۔ چونکہ اس کتاب میں امام غزالی رحمہ اللہ کے رسالہ قدسیہ کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس لیے مسایرہ نام رکھا ہے۔ علامہ کمال الدین محمد بن محمد معروف بابن ابی شریف قدسی شافعی (متوفی ۹۰۵ھ) نے مسایرہ کی مسامرہ کے نام سے شرح لکھی ہے جو بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ (۴) زاد الفقیر مسائل فقہیہ کا مجموعہ ہے ایک سفر میں یہ رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔

۴۰- علامہ قاضی احمد بن محمد طحطاوی (طہطاوی) رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۳۱ھ) مشہور حنفی فقیہ اور علامہ شامیؒ کے استاذ ہیں آپ کی دو کتابیں مطبوعہ ہیں (۱) طحطاوی حاشیہ درمختار چار ضخیم جلدوں میں ہے (۲) طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح آپ کا ایک رسالہ کشف الرین عن بیان المسح علی الجوربین مخطوطہ ہے۔

۴۱- صاحب بزازیہ علامہ کردری ابن البزاز محمد بن محمد بن شہاب رحمہ اللہ (متوفی ۸۲۷ھ) مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ علامہ بزازی سے مشہور ہیں آپ کی دو کتابیں مطبوعہ ہیں (۱) الجامع الوجیز جس کا مشہور نام فتاویٰ بزازیہ ہے فتاویٰ عالم گیری کے حاشیہ پر از جلد نمبر ۴ تا نمبر ۶ طبع ہوئی ہے۔ (۲) مناقب کردری یہ امام اعظمؒ کے مناقب میں دو جلدوں میں ہے مناقب الامام الاعظم اس کا اصل نام ہے۔

۴۲- قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ یحصبی رحمہ اللہ (و ۴۷۶ھ ف ۵۴۴ھ) چھٹی صدی کے مشہور مالکی فقیہ اور محدث ہیں۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔ چند معروف کتابیں یہ ہیں (۱) **الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ** (سیرت نبوی میں بڑی با برکت کتاب ہے (۲) **ترتیب المدارک و تقریب المسالک** (علمائے مالکیہ کے احوال میں ہے) (۳) **مشارق الانوار** (حدیث شریف کی کتاب ہے) (۴) **الالماع الی معرفة اصول الروایه** (اصول حدیث میں ہے) اور غیر مطبوعہ کتابوں میں مسلم شریف کی شرح ہے۔

۴۳- علامہ ابن تیمیہ شیخ الاسلام ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام حرانی دمشقیؒ (و ۶۶۱ھ ف ۷۲۸ھ) ساتویں صدی کے جلیل القدر حنبلی فقیہ بڑے محدث کثیر التصانیف عالم اور مجاہد ہیں۔ آپ کے دادا عبد السلام بھی بڑے محدث تھے نیل الاوطار کا متن المنتقی من احادیث

الاحکام ابن تیمیہ جد کی مشہور کتاب ہے اور ابن تیمیہ حفید کی کتابیں یہ ہیں(۱) الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول(۲) رفع الملام عن الائمة الاعلام(۳) التوسل والوسیلہ(۴) السیاسة الشرعیه فی اصلاح الراعی والرعیه(۵) الفرقان بین اولیاء الله واولیاء الشیطان(۶) فتاویٰ ابن تیمیه (۷) منهاج السنة وغیرہ سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہیں۔

۴۴- علامہ سغدی، شیخ الاسلام، ابو الحسن، علی بن حسین بخاری رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۱ھ) پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب النتف الحسان ہے۔ نُتَف، نُتفَة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ''تھوڑا سا'' کہا جاتا ہے اعطاہ نتفة من الطعام: اس نے تھوڑا سا کھانا دیا، افادہ نتفة من العلم: اس نے تھوڑا سا علم سکھایا اور حسان، حسنة کی جمع ہے پس النتف الحسان کا مطلب ہے: ''شاندار باتوں کا مختصر سا مجموعہ'' کیونکہ یہ کتاب فتاویٰ کا انتخاب ہے۔ اس کا مخطوطہ ترکیا کی ٹوپ کاپی میوزیم میں ہے۔ آپ نے جامع کبیر کی بھی شرح لکھی ہے۔ فتاویٰ قاضی خان اور فتاویٰ بزازیہ میں آپ کا کثرت سے تذکرہ آتا ہے آپ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ کے تلمیذ اور بخاریٰ کے قاضی تھے (اعلام ج ۴، ص ۲۷۹ـ فوائد بہیہ ص ۵۰)

۴۵- ابن ملک علامہ عبد اللطیف بن عبد العزیز رحمہ اللہ (متوفی ۸۰۱ھ) آٹھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور محدث ہیں آپ کی مشارق الانوار کی شرح مبارق الانوار مطبوعہ ہے نیز المنار کی شرح بھی مطبوعہ ہے اور مجمع البحرین کی شرح مخطوطہ ہے آپ کے پردادا کا نام فرشتہ تھا اس لیے آپ کو عربی میں ابن ملک کہتے تھے۔

۴۶- علامہ حسن بن عمار شرنبلالی رحمہ اللہ (و ۹۹۴ھ ف ۱۰۶۹ھ) گیارھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) نور الایضاح (۲) مراقی الفلاح شرح نور الایضاح (۳) غنیۃ ذوی الاحکام فی بغیۃ درر الحکام (درر کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے) (۴) منظومہ ابن وہبان کی شرح (۵) التحقیقات القدسیہ (مجموعہ رسائل شرنبلالی کل ۴۸ رسائل ہیں)۔

۴۷- حقائق المنظومہ مفتی الثقلین علامہ نسفی رحمہ اللہ کے منظومۃ الخلافیات (۲۵) کی شرح ہے شارح کا نام ابو المحامد محمود بن محمد افسنجی بخاری (و ۶۲۷ھ ف ۶۷۱ھ) ہے۔ حقائق کا مخطوطہ مدینہ منورہ میں ہے (اعلام ج ۷، ص ۱۸۲)

۴۸- علامہ ابراہیم بن محمد حلبی رحمہ اللہ (متوفی ۹۵۶ھ) دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں آپ کا مشہور متن ملتقی الابحر (۲۵) ہے باقی کتابیں یہ ہیں (۱) غنیۃ المتملی فی شرح منیۃ المصلی (کبیری سے مشہور ہے) (۲) صغیری شرح منیہ (۳) قاموس کی تلخیص (۴) فتاویٰ تاتارخانیہ کی تلخیص (۵) الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ کی تلخیص۔

۴۹- امام نووی، یحییٰ بن شرف رحمہ اللہ (و ۶۳۱ھ ف ۶۷۶ھ) ساتویں صدی کے مشہور شافعی فقیہ اور بڑے محدث ہیں۔ حوران کے قریب نوانامی گاؤں میں ولادت و وفات ہوئی ہے آپ کثیر التصانیف ہیں۔ چند یہ ہیں (۱) المنہاج شرح مسلم شریف (۲) التقریب والتیسیر (اصول حدیث میں) (۳) منہاج الطالبین (۴) ریاض الصالحین (۵) تہذیب الاسماء واللغات وغیرہ۔

۵۰- طرسوی، قاضی القضاۃ، علامہ نجم الدین ابراہیم بن علی بغدادی رحمہ اللہ (و ۷۲۰ھ ف ۷۵۸ھ) کل عمر ۳۸ سال آٹھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور کثیر التصانیف علامہ ہیں آپ کی کتاب انفع الوسائل الی تحریر المسائل فقہ کی کتاب ہے اور مطبوعہ ہے۔ یہی فتاویٰ طرطوسیہ سے بھی معروف ہے۔ دوسری کتاب وفیات الاعیان مخطوطہ ہے (۶۰)

۵۱- فقیہ ابو اللیث سمرقندی، امام الہدیٰ نصر بن محمد رحمہ اللہ (متوفی ۳۷۳ھ) چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور بڑے بزرگ ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کتابیں یہ ہیں۔ (۱) بستان العارفین (۲) خزانۃ الفقہ (۳) تنبیہ الغافلین (۴) مقدمہ ابی اللیث (۵) کتاب النوازل (اس کتاب میں محمد بن شجاع ثلجی (تلمیذ حسن بن زیاد) محمد بن مقاتل رازی (۶۴) محمد بن سلمہ بلخی، نصیر بن یحییٰ بلخی (۶۵) ابو نصر محمد بن سلام بلخی (۶۶) ابو بکر محمد بن احمد اسکاف بلخی (تلمیذ محمد بن سلمہ) علی بن احمد فارسی، فقیہ ابو جعفر محمد بن عبداللہ ہندوانی بلخی (تلمیذ ابو بکر اسکاف) اور خود فقیہ ابو اللیث سمرقندی کے بیان کردہ مسائل کو جمع کیا گیا ہے (اعلام و کشف الظنون ص ۱۹۸۱) اور غیر مطبوعہ کتابیں یہ ہیں۔ تفسیر القرآن۔ عمدۃ العقائد، فضائل رمضان، شرح جامع صغیر، عیون المسائل، رقائق الاخبار فی بیان اہل الجنۃ واہوال النار، مختلف الروایۃ، شرعۃ الاسلام، اصول الدین اور مبسوط وغیرہ۔

۵۲- قاضی ابو خازم عبدالحمید بن عبدالعزیز سکونی رحمہ اللہ (متوفی ۲۹۲ھ) تیسری صدی

کے مشہور حنفی فقیہ، امام محمدؒ کے بیک واسطہ تلمیذ اور امام طحاوی کے استاذ ہیں۔ امام کرخیؒ بھی آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ کی تصنیفات یہ ہیں ادب القاضی، لباب الفرائض، شرح جامع کبیر وغیرہ (معجم المؤلفین ج ۵، ص ۱۰۱۔ اعلام ج ۳، ص ۲۸۷۔ فوائد بہیہ ص ۳۸)

۵۳- جرجانی امام ابوعبداللہ یوسف بن محمد، مشہور حنفی فقیہ ہیں، سن وفات متعین نہیں، امام کرخی کے شاگرد ہیں، چوتھی صدی کے ہیں۔ تصنیفات یہ ہیں۔ زیادات کی شرح، جامع کبیر کی شرح، مختصر، کرخی کی شرح، (خزانۃ الاکمل غالبًا آپ کی نہیں ہے۔ آپ کے کسی ہمنام عالم کی ہے)

۵۴- جمال الدین حصیری ابوالمحامد محمود بن احمد بخاری رحمہ اللہ (و ۵۴۶ھ ف ۶۳۶ھ) چھٹی صدی کے جلیل القدر حنفی فقیہ ہیں انتہت الیہ ریاسۃ الحنفیہ فی زمانہ۔ بخاریٰ کے ایک ایسے محلّہ میں جس میں چٹائیاں بنی جاتی تھیں آپ کی ولادت ہوئی تھی، وفات دمشق میں ہوئی۔ آپ کی تصنیفات یہ ہیں (۱) التحریر فی شرح الجامع الکبیر (سات جلدوں میں) (۲) خیر المطلوب فی العلم المرغوب (۳) الطریقۃ الحصیریہ فی الخلاف بین الشافعیہ والحنفیہ (۴) النجم الهادی الساری الیٰ حل الفاظ صحیح البخاری (۵) الوجیز (فتاویٰ کا مجموعہ)

۵۵- ابوحفص کبیر بخاری، علامہ احمد بن حفص رحمہ اللہ، سن وفات محفوظ نہیں، امام محمد رحمہ اللہ کے خاص شاگرد ہیں اور ان کی کتابوں کے راوی ہیں۔ کتاب الاصل کی اب صرف دو ہی روایتیں باقی ہیں ایک آپ کی اور دوسری ابوسلیمان جوزجانی (۵۶) کی آپ کے والا تبار صاحبزادے محمد بن احمد ابوحفص صغیر کہلاتے ہیں۔

۵۶- جوزجانی ابوسلیمان موسیٰ بن سلیمان رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۰ھ کے بعد) امام محمد رحمہ اللہ کے خاص شاگرد ہیں اور ان کی مبسوط کے راوی ہیں۔ مطبوعہ کتاب الاصل آپ ہی کی روایت ہے۔ خراسان میں بلخ کے مضافات میں جوزجان ایک بستی ہے اس کی طرف نسبت ہے قیام بغداد میں رہا۔ مشہور فقیہ معلّٰی بن منصور (۸۰) کے خاص دوست تھے اور معلّٰی سے عمر میں اور شہرت میں بڑھے ہوئے تھے آپ کی ایک تصنیف نوادر الفتاویٰ ہے جس کا مخطوطہ غالبًا دار الکتب المصریہ میں ہے۔

۵۷- ہشام بن عبداللہ رازیؒ رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۱ھ) صاحبین کے خاص شاگرد اور بڑے

محدث ہیں۔ ری میں آپ ہی کے مکان میں امام محمد رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تھا آپ کی ایک تصنیف صلوٰۃ الاثر کا ذکر ملتا ہے (اعلام ج۸ص۷۸ فوائد بہیہ ص۹۳)

۵۸- ابن سماعہ، ابوعبداللہ محمد بن سماعہ تمیمی رحمہ اللہ (و ۱۳۰ھ ف ۲۳۳ھ) صاحبین اور حسن بن زیاد رحمہم اللہ کے شاگرد اور امام طحاوی کے استاذ ابوجعفر احمد بن ابی عمران کے استاذ ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں کتاب النوادر بھی ہے۔ اس میں صاحبین سے سنے ہوئے مسائل جمع کیے ہیں۔ ایک سو چار سال عمر ہوئی تھی مگر قویٰ کا یہ حال تھا کہ گھوڑے پر سواری کرتے، کنواری لڑکی سے شادی کرتے اور روزانہ دو سو رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان کے انتقال پر محدث کبیر یحییٰ بن معینؒ نے فرمایا کہ **مات ریحانۃ العلم من اھل الرای** (فقہاء میں سے علم کا گلدستہ اٹھ گیا (فوائد بہیہ ص۶۹)

۵۹- امام اوزاعی، عبدالرحمٰن بن عمرو بن محمد رحمہ اللہ (و ۸۸ھ ف ۱۵۷ھ) ملک شام کے مشہور مجتہد امام اعظمؒ کے معاصر ہیں عرب کے قبیلہ اوزاع سے نسبی تعلق تھا، بیردت میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں (۱) کتاب السنن (فقہ کی کتاب ہے) (۲) المسائل (اس میں ستر ہزار سوالات کے جوابات ہیں) (۳) سیر اوزاعی (اس کا امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے رد لکھا ہے جس کا نام کتاب الرد علی سیر الاوزاعی ہے جو مولانا ابوالوفا افغانیؒ کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام ص۳۰۳۔۳۳۵ میں دونوں کتابوں میں محاکمہ کیا ہے (اعلام ج۳، ص۳۲۰ تدوین سیر و مغازی ص۲۹۷)

۶۰- علمائے احناف کے احوال میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مشہور درج ذیل ہیں:

(۱) الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیۃ، دو جلدوں میں مطبوعہ ہے از علامہ عبدالقادر قرشی (و ۶۹۶ھ ف ۷۷۵ھ) وھو اول من صنف فی طبقاتہم (الاعلام ج۴ص۴۲)

(۲) تاج التراجم مختصر کتاب ہے اور مطبوعہ ہے از علامہ قاسم بن قطلو بغا (۱۰)

(۳) وفیات الاعیان من مذہب ابی حنیفۃ النعمان، اس کا مخطوطہ کتب خانہ ظاہریہ میں ہے۔ از علامہ طرسوی (۵۰)

(۴) الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ، مطبوعہ ہے از علامہ تقی الدین بن عبدالقادر

تمیمی غزی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۱۰ھ)

(۵) کتاب اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار ابھی تک مخطوطہ ہے از علامہ محمد بن سلیمان رومی کفوی رحمہ اللہ متوفی تقریباً ۹۹۰ھ) کفہ روم کی ایک بستی ہے۔ مولانا لکھنویؒ (۲۶) نے الفوائد البہیہ میں اس کی تلخیص کی ہے اور اس پر اضافے کیے ہیں۔

(۶) الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات السنیۃ' مطبوعہ ہے از علامہ عبدالحی رحمہ اللہ (۲۶)۔

۶۱- ابوجعفر ہندوانی بلخی محمد بن عبداللہ رحمہ اللہ (متوفی ۳۶۲ھ بعمر ۶۲ سال) بڑے حنفی فقیہ اور محدث ہیں' اپنی فقاہت کی وجہ سے ابوحنیفہ صغیر کہلاتے تھے۔ چار واسطوں سے امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ (۵۱) کے استاذ ہیں۔ وفات بخاری میں ہوئی ہے۔ ہندواں' شہر بلخ کا ایک محلہ تھا جہاں ہندوستان سے درآمد کردہ بردے اتارے جاتے تھے۔ اس محلہ کی طرف نسبت ہے۔ مولانا لکھنویؒ نے آپ کے متعلق لکھا ہے: شیخ کبیر وامام جلیل القدر من اہل بلخ' کان علی جانب عظیم من الفقہ والذکاء' والزہد والورع...... حدث ببلخ وافتی بالمشکلات واوضح المعضلات اھ (فوائد بہیہ ص ۱۷۳ اللباب فی تہذیب الانساب لابن اثیر الجزری ج ۳' ص ۳۹۴)

۶۲- ابن رستم' ابوبکر ابراہیم بن رستم مروزی رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۱ھ) امام محمد رحمہ اللہ کے خاص شاگرد ہیں۔ آپ نے کتاب النوادر میں امام محمدؒ سے سنے ہوئے مسائل جمع کیے ہیں۔ امام ابوعصمہ نوح مروزی اور امام اسد بجلی (تلامذہ امام اعظمؒ) سے بھی استفادہ کیا ہے (فوائد بہیہ ص ۱۰)

۶۳- ابوعبداللہ محمد بن سلمہ بلخی رحمہ اللہ (و ۱۹۲ھ ف ۲۷۸ھ) مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ پہلے شداد بن حکیم سے پڑھا جو امام زفرؒ کے شاگرد ہیں پھر ابوسلیمان جوزجانی سے پڑھا جو امام محمدؒ کے شاگرد ہیں۔

۶۴- امام محمد بن مقاتل رازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۸ھ) مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ ابن بابویہ نے تاریخ ری میں لکھا ہے کہ **کان امام اصحاب الرای بالری' ومات بھا' وکان مقدما فی الفقہ** (لسان المیزان ج ۵' ص ۳۸۸)۔

نوٹ: ایک محمد بن مقاتل رازی امام محمدؒ کے شاگرد بھی ہیں وہ دوسرے فقیہ ہیں۔ فوائد بہیہ میں ان کا تذکرہ ہے۔

۶۵- نصیر بن یحییٰ بلخی رحمہ اللہ (متوفی ۲۶۸ھ) آپ ابو سلیمان جوز جانی کے شاگرد ہیں۔

۶۶- ابو نصر محمد بن سلام بلخی رحمہ اللہ آپ امام ابو حفص کبیر کے معاصر ہیں۔ سن وفات اور کس سے تلمذ ہے یہ معلوم نہ ہو سکا رسم المفتی اور شامی ج ۱ ص ۵۲ میں آپ کا نام قاسم لکھا ہے اور فوائد بہیہ ص ۶۸ میں محمد ہے واللہ اعلم بالصواب۔

۶۷- ناطف کے معنی ہیں ریوڑی (ایک مٹھائی) ناطفی: ریوڑی بنانے والا یا بیچنے والا۔ ناطفی کا نام احمد بن محمد کنیت ابو العباس، نسبت ناطفی اور وطن ری تھا آپ نے ابو عبداللہ جرجانی سے پڑھا ہے جو امام جصاص رازی کے شاگرد ہیں۔ سن وفات ۴۴۶ھ ہے آپ کی متعدد تصانیف ہیں چند یہ ہیں۔ اجناس، احکام اور روضہ کے مخطوطے موجود ہیں اور مجموع النوازل والواقعات ناپید ہے۔

۶۸- صدر شہید، الصدر الماضی، الصدر الکبیر، ابو الصدور، برہان الدین الکبیر، ابن مازہ، برہان الائمہ، حسام الدین، ابو محمد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (و ۴۸۳ھ ف ۵۳۶ھ) چھٹی صدی کے اکابر احناف میں سے ہیں، سمرقند میں شہید کئے گئے اور بخاری میں دفن کیے گئے، چند تصانیف یہ ہیں۔ (۱) جامع (۲) فتاویٰ صغریٰ (۳) فتاویٰ کبریٰ (۴) عمدۃ المفتی والمستفتی (۵) واقعات حسامیہ (۶) شرح ادب القاضی (۷) شرح جامع صغیر (ان کتابوں کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطے موجود ہیں) واقعات حسامیہ میں فقیہ ابو اللیث کی کتاب النوازل اور ناطفی (۶۷) کے واقعات کو جمع کیا ہے۔ ابو بکر محمد بن فضل کے فتاویٰ اور مفتیان سمرقند کے فتاویٰ کو بھی اس میں لیا گیا ہے (اعلام و کشف الظنون ج ۲، ص ۱۹۹۸) آپ کے پوتے برہان الدین محمود بھی بڑے فقیہ ہیں دیکھیے (۷۰)

۶۹- خلاصہ الفتاویٰ از علامہ افتخار الدین طاہر بن احمد بن عبدالرشید بخاری رحمہ اللہ (و ۴۸۲ھ ف ۵۴۲ھ) چھٹی صدی کے اکابر احناف میں سے ہیں۔ ابن کمال پاشا نے آپ کو مجتہدین فی المسائل کے طبقہ میں شمار کیا ہے، قاضی خان کے شاگرد ہیں۔ خلاصہ الفتاویٰ مطبوعہ ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی دو کتابوں خزانۃ الواقعات اور کتاب النصاب کا اختصار کیا ہے۔

۷۰- علامہ رضی الدین سرخسی محمد بن محمد رحمہ اللہ (متوفی ۵۷۱ھ) چھٹی صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں آپ کی محیط المحیط الرضوی اور المحیط السرخسی کہلاتی ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ آپ نے تین محیطیں لکھی ہیں۔ کبیر (دس جلدوں میں) متوسط (چار جلدوں میں) اور صغیر (دو جلدوں میں) تینوں ہنوز مخطوطہ ہیں۔ محیط (احاطہ کرنے والی) اصول، نوادر اور نوازل کا احاطہ کرتی ہے اس لیے محیط نام رکھا ہے۔ کشف الظنون ج ۲، ص ۱۶۲۰ میں وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ سماہ محیطا لشمولہ علی مسائل الکتب وفوائد ہا وحقائقہا اھ۔

نوٹ: محیط کے نام سے ایک اور کتاب بھی مشہور ہے وہ المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ہے۔ از علامہ برہان الدین محمود بن تاج الدین احمد بن صدر الدین برہان الائمہ عمر بن مازہ (۶۸) بخاری مرغینانی رحمہ اللہ (و ۵۵۱ھ ف ۶۱۶ھ) آپ نے اپنی محیط کی تلخیص بھی کی ہے جو الذخیرۃ البرہانیہ سے معروف ہے کتب فقیہ میں بکثرت ان دو کتابوں کے حوالے آتے ہیں آپ کی محیط المحیط الکبیر بھی کہلاتی ہے اور الذخیرۃ البرہانیہ ذخیرۃ الفتاویٰ سے بھی معروف ہے یہ دونوں کتابیں ہنوز مخطوطہ ہیں۔ ابن کمال پاشا نے آپ کو مجتہدین فی المسائل میں شمار کیا ہے۔ آپ صدر شہید ابن مازہ رحمہ اللہ (۶۸) کے پوتے ہیں۔

۷۱- خواہر زادہ (بھانجا) شیخ الاسلام بکر، محمد بن حسین بخاری (متوفی ۴۸۳ھ) پانچویں صدی کے بڑے فقیہ ہیں علمائے ماوراء النہر میں آپ کا بڑا مقام تھا۔ قاضی ابو ثابت محمد بن احمد بخاری کے بھانجے تھے اس لیے خواہر زادہ سے شہرت ہوئی۔ مبسوط کے علاوہ آپ نے مختصر اور تجنیس بھی لکھی مگر سب کتابیں ناپید ہیں۔

نوٹ: خواہر زادہ کے عرف سے شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری (۸۴) کے بھانجے علامہ بدرالدین محمد بن محمود کردری بھی مشہور ہیں جنکی وفات ۶۵۱ھ میں ہوئی ہے۔

۷۲- شیخ اسماعیل بن عبدالغنی نابلسی فلسطینی رحمہ اللہ (و ۱۰۱۷ھ ف ۱۰۶۲ھ) مشہور حنفی فقیہ اور بڑے باپ کے بیٹے ہیں آپ نے الدرر کی بارہ جلدوں میں شرح لکھی ہے جس کا نام الاحکام ہے اور غیر مطبوعہ ہے آپ کے والد عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ کثیر التصانیف مشہور حنفی فقیہ ہیں۔

۷۳- علی رازی رحمہ اللہ قدمائے احناف میں سے ہیں۔ محمد بن شجاع کے معاصر ہیں۔ حسن بن زیاد کے شاگرد ہیں۔ آپ کی ایک تصنیف کتاب الصلوۃ کا تذکرہ ملتا ہے (فوائد ص ۵۸)

۷۴- علامہ ابن امیر حاج حلبی ابو عبداللہ، شمس الدین محمد بن محمد رحمہ اللہ (و۸۲۵ھ ف۸۷۹ھ) نویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب التقریر والتحبیر تین جلدوں میں مطبوعہ ہے(۳۹) اور منیۃ المصلی کی شرح حلیۃ المجلی مخطوطہ ہے (حلیہ: زیور المجلی: میدان میں آگے رہنے والا گھوڑا۔ المصلی دوڑ میں دوسرے نمبر پر آنے والا گھوڑا)۔

۷۵- امام ابو نصر عتابی احمد بن محمد بخاری رحمہ اللہ (متوفی ۵۸۰ھ) چھٹی صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ بخاری کے ایک محلہ عتابیہ کی طرف نسبت ہے۔ تصنیفات یہ ہیں (۱) جامع کبیر کی شرح (۲) جامع صغیر کی شرح (۳) زیادات کی شرح (۴) فتاویٰ عتابیہ (جوامع الفقہ (۵) تفسیر القرآن وغیرہ۔ حافظ الدین بخاری (۷۷) اور شمس الائمہ کردری (۸۴) آپ کے تلامذہ ہیں (اعلام ج۱ ص۲۱۶ مقدمہ زیادات الزیادات ص۱۲)

۷۶- علامہ ذہبی محمد بن احمد بن عثمان بن قائماز رحمہ اللہ (و۶۷۳ھ ف۷۴۸ھ) آٹھویں صدی کے مشہور محدث، مؤرخ، علامہ محقق، کثیر التصانیف شافعی عالم ہیں۔ ولادت و وفات دمشق میں ہوئی ہے۔ آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) تذکرۃ الحفاظ (۲) میزان الاعتدال فی نقد الرجال (۳) سیر اعلام النبلاء (۴) دول الاسلام (۵) تاریخ الاسلام (۶) العبر فی خبر من غبر (۷) تذہیب تہذیب الکمال وغیرہ بہت سی کتابیں مطبوعہ ہیں۔

۷۷- حافظ الدین بخاری محمد بن محمد بن نصر رحمہ اللہ (و۶۱۵ھ ف۶۹۳ھ) ساتویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری (۸۳) اور ابوالفضل عبیداللہ محبوبی کے شاگرد ہیں اور علامہ سغناقی شارح ہدایہ عبدالعزیز بن احمد بخاری وغیرہ کے استاذ ہیں۔

۷۸- امام زفر بن ہذیل عنبری تمیمی رحمہ اللہ (و۱۱۰ھ ف۱۵۸ھ) امام اعظم کے تلمیذ اور جلیل القدر امام ہیں، صاحبین کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے۔ آپ کا نکاح امام اعظم رحمہ اللہ نے پڑھا ہے۔ خطبہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ ہذا زفر بن الہذیل امام من ائمۃ المسلمین، وعلم من اعلامہم فی شرفہ وحسبہ وعلمہ (جواہر مضیہ ص۲۴۳) وفات عالم شباب میں ۴۸ سال کی عمر میں ہوئی فقہ حنفی میں متعدد مسائل میں آپ کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔

۷۹- امام حسن بن زیاد لولوی کوفی رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۴ھ) امام اعظم کے خاص تلمیذ اور مشہور امام ہیں، امام زفر رحمہ اللہ کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے بلکہ بعض حضرات نے آپ کو امام

زفر کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ آپ کے والد موتیوں کے تاجر تھے۔ آپ کی کتابیں یہ ہیں۔
(۱) کتاب المجرد (۲) کتاب الامالی (۳) ادب القاضی (۴) معانی الایمان (۵) النفقات (۶) الخراج (۷) الفرائض (۸) الوصایا آپ ۱۹۴ھ میں کوفہ کے قاضی تھے۔

۸۰- معلّٰی بن منصور رازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۱ھ) مشہور حنفی فقیہ اور ثقہ محدث ہیں۔ صاحبین کے تلمیذ ہیں۔ قال ابن حبان فی الثقات: کان ممن جمع وصنف آپ کی کتابوں میں کتاب النوادر اور الامالی ہیں جو دونوں فقہ میں ہیں۔

۸۱- حاکم شہید ابو الفضل محمد بن محمد بن احمد مروزی بلخی رحمہ اللہ (متوفی ۳۳۴ھ) مشہور محدث، قاضی وزیر حنفی فقیہ اور امام محمد کی کتابوں کے مرتب ہیں۔ حدیث میں ابو رجاء محمد بن حمدویہ کے واسطہ سے امام احمد رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ پہلے آپ بخارا کے قاضی بنائے گئے پھر عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے اور ۳۳۴ھ میں ایک عوامی شورش میں بحالت سجدہ شہید کئے گئے۔ جس کی آپ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ آپ کی کتاب الکافی اصول ستہ کا خلاصہ ہے اور المنتقی کتب اصول کے علاوہ تین سو کتابوں کا خلاصہ ہے اور نوادر، نوازل اور واقعات پر مشتمل ہے۔

۸۲- علامہ ابو القاسم سید ناصر الدین محمد بن یوسف علوی حسنی مدنی سمرقندی رحمہ اللہ (متوفی ۵۵۰ھ) چھٹی صدی کے حنفی فقیہ ہیں۔ تصنیفات میں مبسوط کے علاوہ الفقہ النافع، جامع الفتاویٰ، مصابیح السبل اور الملتقط فی الفتاویٰ الحنفیۃ (مآل الفتاویٰ) ہیں یہ سب کتابیں مخطوطہ ہیں اور مبسوط ناپید ہے۔

۸۳- حاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن حمدویہ نیشاپوری رحمہ اللہ (و ۳۲۱ھ ف ۴۰۵ھ) مشہور محدث اور مؤرخ ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب المستدرک علی الصحیحین چار جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ معرفۃ علوم الحدیث اور المدخل بھی مطبوعہ ہیں اور تاریخ نیشاپور وغیرہ بہت سی کتابیں ابھی طبع نہیں ہوئیں آپ ابن بیّع سے بھی مشہور ہیں۔

۸۴- شمس الائمہ محمد بن عبدالستار عمادی کردری بخاری رحمہ اللہ (و ۵۹۹ھ ف ۶۴۲ھ) ساتویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ قاضی خان، صاحب ہدایہ، شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری اور صاحب شرعۃ الاسلام امام زادہ کے تلمیذ ہیں اور حمید الدین ضریر، حافظ الدین بخاری اور خواہر زادہ محمد بن محمود کے استاذ ہیں تصنیفات یہ ہیں (۱) مختصر (فقہ میں) (۲) الرد والانتصار (علم کلام

میں) دونوں کتابیں مخطوطہ ہیں اور دوسری کتاب میں امام غزالیؒ کی المنخول پر رد ہے۔

نوٹ: مناقب الامام الاعظم اور الوجیز فی الفتاویٰ (فتاویٰ بزازیہ) کے مصنف دوسرے کردری ہیں دیکھئے (۴۱)

۸۵- شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری رحمہ اللہ (۴۲۷ھ ف ۵۱۲ھ) پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں، شمس الائمہ حلوائی کے تلمیذ ہیں زرنج، زرنگر کا معرب ہے جو بخاری کے گاؤں میں سے ایک گاؤں ہے۔

۸۶- شمس الائمہ عماد الدین عمر بن بکر بن محمد زرنجری رحمہ اللہ (متوفی ۵۸۴ھ) چھٹی صدی کے مشہور فقیہ اور بڑے باپ کے بیٹے ہیں اپنے والد شمس الائمہ بکر (۸۵) کے شاگرد اور شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری (۸۴) کے استاذ ہیں۔

۸۷- شمس الائمہ اسماعیل بن حسن غازی بیہقی رحمہ اللہ (متوفی ۴۰۲ھ) تیسری صدی کے حنفی فقیہ ہیں۔تصنیفات یہ ہیں۔(۱) المجرد (اس میں امام محمد کی مبسوط، جامع کبیر، جامع صغیر اور زیادات کی تلخیص کی ہے) (۲) الشامل (المجرد کی شرح ہے) (۴) کفایۃ الفقہاء (قدوری کی شرح ہے) (معجم المؤلفین ج ۱ ص ۲۶۴۔ کشف الظنون ۱۰۲۴ و ۱۵۹۳)

۸۸- شمس الائمہ محمود بن عبدالعزیز اوزجندی رحمہ اللہ، قاضی خان کے جد امجد اور سرخسی کے استاذ ہیں (فوائد بہیہ ص ۸۶)

۸۹- قرطبی، مفسر، ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری اندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۶۷۱ھ) ساتویں صدی کی مایہ ناز شخصیت ہیں۔تصانیف یہ ہیں (۱) الجامع لاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی (۲) الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ (۳) التذکار فی افضل الاذکار (۴) التذکرہ باحوال الموتیٰ و احوال الآخرہ (۵) التقریب لکتاب التمہید وکان ورعا متعبدا، طارحا للتکلف یمیشی بثوب واحد و علی رأسہ طاقیۃ (اعلام ج ۵، ص ۳۲۲)

۹۰- محیی الدین ابو زکریا احمد بن ابراہیم دمشقی دمیاطی معروف بہ ابن النحاس رحمہ اللہ (متوفی ۸۱۴ھ) ساتویں صدی کے شافعی فقیہ اور مجاہد ہیں۔فرنگیوں کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے تصانیف یہ ہیں (۱) المغنم فی الورد الاعظم (۲) مشارع الاشواق (۳) تنبیہ الغافلین (۴) شرح مقامات حریری وغیرہ (اعلام ج ۱ ص ۸۷۔ کشف الظنون ص ۴۸۷)

۹۱- فتاویٰ ولوالجیہ دو جلدوں میں ہے اور ہنوز مخطوطہ ہے قونیہ میں اس کا نسخہ ہے۔ اس کے مصنف علامہ ظہیر الدین ابو الفتح عبدالرشید بن ابی حنیفہ بن عبدالرزاق ولوالجی رحمہ اللہ (و ۴۶۷ھ ف ۵۴۰ھ کے بعد) ہیں۔ ولوالج بدخشان کا ایک شہر ہے۔

۹۲- الحاوی القدسی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے مصنف کا بھی صحیح پتہ نہیں۔ حموی نے شرح اشباہ میں لکھا ہے کہ یہ قدس کے قاضی کی کتاب ہے جن کا حال معلوم نہیں اور ابن الشحنہ نے جواہر مضیہ کے حواشی میں اس کے مصنف کا نام قاضی جمال الدین احمد بن محمد بن نوح قابسی غزنوی (متوفی ۶۰۰ھ کے آس پاس) بیان کیا ہے۔ اور اس کو قدسی کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مصنف نے یہ کتاب بیت المقدس میں لکھی ہے۔ کشف الظنون میں ایک قول یہ ہے کہ اس کے مصنف محمد غزنوی ہیں۔ اور ابن امیر حاج شرح منیہ میں لکھتے ہیں کہ اس کا مصنف کوئی فرغانی ہے۔ واللہ اعلم (فوائد بہیہ ص ۱۰۳)

نوٹ: فقہ حنفی میں دو حاویاں اور بھی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) الحاوی الحصیری از ابو بکر محمد بن ابراہیم بن انوش حصیری رحمہ اللہ (متوفی ۵۰۰ھ) آپ سرخسی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ یہ حاوی ابھی تک مخطوطہ ہے۔ کشف الظنون میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔

(۲) الحاوی الزاہدی از نجم الدین مختار بن محمود زاہدی غزمینی رحمہ اللہ (متوفی ۶۵۸ھ) یہ بھی مخطوطہ ہے۔ مصنف کے احوال کے لیے دیکھیں (۳۳)

۹۳- شارح وہبانیہ علامہ عبدالبر بن محمد بن محمد حلبی معروف بہ ابن الشحنۃ الصغیر (چھوٹے داروغہ زادہ) (متوفی ۹۲۱ھ) نویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ ابن الہمام کے تلمیذ ہیں آپ کی منظومہ وہبانیہ کی شرح ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ منظومہ وہبانیہ شیخ عبدالوہاب بن احمد بن وہبان دمشقی (متوفی ۷۶۸ھ) کا ہے خود مصنف نے اس کی شرح دو جلدوں میں لکھی ہے۔ اصل قصیدہ کا نام قید الشرائد ونظم الفرائد ہے اور شرح کا نام عقد القلائد فی حل قید الشرائد ہے ابن عبدالبر نے مصنف کی شرح ہی کو سامنے رکھ کر تہذیب و اضافہ کیا ہے اور تفصیل عقد الفوائد بتکمیل قید الشرائد نام رکھا ہے۔ ان کے دادا ابن الشحنہ کبیر کہلاتے ہیں (۹۴) (حواشی فوائد بہیہ و کشف الظنون)

۹۴- ابن الشحنہ کبیر، محب الدین ابوالولید محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمود حلبی (و ۷۴۹ھ ف ۸۱۵ھ) آٹھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ ابن الشحنہ خاندانی لقب ہے آپ نے ہدایہ کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام نہایۃ النہایہ فی شرح الہدایہ ہے۔ مگر مکمل نہیں ہوسکی۔ آپ علامہ ابن الہمام کے استاذ ہیں اعلام میں اور بھی متعدد تصانیف کا ذکر ہے۔ کشف الظنون (ج ۲، ص ۲۰۳۶) میں سن وفات ۸۹۰ھ لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

۹۵- علامہ ابن عبدالبر، ابو عمر یوسف بن عبداللہ قرطبی، مالکی رحمہ اللہ (و ۳۶۸ھ ف ۴۶۳ھ) پانچویں صدی کے مشہور مؤرخ، ادیب، مالکی فقیہ، بڑے محدث، حافظ المغرب اور کثیر التصانیف امام ہیں۔ چند تصنیفات یہ ہیں (۱) التمہید لمافی الموطا من المعانی والاسانید (۲) الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار (التمہید کا اختصار) (۳) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (۴) جامع بیان العلم وفضلہ (۵) الدرر فی اختصار المغازی والسیر (۶) الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء (مالک وابی حنیفۃ والشافعی) (۷) الانصاف فیما بین العلماء من الاختلاف وغیرہ۔

۹۶- شیخ عبدالوہاب شعرانی، علامہ ابو محمد عبدالوہاب بن احمد شعرانی شافعی رحمہ اللہ (و ۸۹۸ھ ف ۹۷۳ھ) دسویں صدی کے مشہور صوفی، فقیہ، کثیر التصانیف عالم ہیں۔ مصر کے ایک گاؤں ساقیہ ابوشعرہ میں بود و باش رہی اس لیے اس کی طرف نسبت ہے۔ وفات قاہرہ میں ہوئی چند تصانیف یہ ہیں (۱) الکبریت الاحمر فی علوم الشیخ الاکبر (۲) کشف الغمۃ عن جمیع الامۃ (۳) لطائف المنن (۴) المیزان الکبریٰ (۵) الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر وغیرہ۔

۹۷- فتاویٰ سراجیہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کا مصنف کون ہے؟ علامہ شامی رحمہ اللہ نے ردالمحتار ج ۲، ص ۱۰۷ میں اس کی نسبت علامہ سراج الدین قاریٔ الہدایہ کی طرف کی ہے۔ بروکلمن نے بھی ان کی طرف نسبت کی ہے مگر اعلام ج ۵ ص ۵۷ کے حاشیہ میں اس کی نفی کی ہے اور یہ بات بایں وجہ معقول ہے کہ قاری الہدایہ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اس لیے ان شاء اللہ صحیح یہ ہے کہ:

فتاویٰ سراجیہ کے مصنف علامہ سراج الدین، ابوحفص، عمر بن اسحاق بن احمد ہندی غزنوی مصری رحمہ اللہ (و ۷۰۴ھ یا ۷۱۴ھ ف ۷۷۳ھ) ہیں آپ آٹھویں صدی کے کبار

احناف میں سے کثیر التصانیف عالم ہیں۔ چند کتابیں یہ ہیں (۱) التوشیح (ہدایہ کی شرح) (۲) الغرۃ المنیفۃ فی ترجیح مذہب ابی حنیفہ (مطبوعہ) (۳) شرح عقیدۃ الطحاوی (مطبوعہ) (۴) زبدۃ الاحکام فی اختلاف الائمہ (۵) کاشف معانی البدیع و بیان مشکلہ المنیع (شرح بدیع النظام الجامع بن کتابی البزدوی والاحکام لابن الساعاتی (۱۰۳) یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور مخطوطہ ہے شرح بدیع للھندی سے یہی کتاب مراد ہے) (۶) شرح المغنی للخبازی (اصول فقہ کی کتاب ہے اور دو جلدوں میں مخطوطہ ہے) (۷) شرح الزیادات (۸) شرح الجامع الکبیر للشیبانی (اعلام ج ۵، ص ۴۲۔ معجم المؤلفین ج ۸، ص ۲۷۶)

۹۸- امام ابن المبارک، شیخ الاسلام ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارک مروزی رحمہ اللہ (و ۱۱۸ھ ف ۱۸۱ھ) امام اعظم رحمہ اللہ کے خاص تلمیذ، مجتہد مقید، بڑے محدث اور مجاہد ہیں مرو کی طرف نسبت ہے جو خراسان کا مشہور شہر ہے ایک جہاد سے واپسی میں ساحل فرات پر انتقال فرمایا۔ آپ کی چند کتابیں ہیں۔ ان میں سے کتاب الرقاق طبع ہوئی ہے۔

۹۹- فتاویٰ تاتارخانیہ (تتارخانیہ) حنفی فقہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کے مصنف علامہ فرید الدین عالم بن علاء انصاری اندرپتی دہلوی ہیں جن کی وفات ۷۸۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس کتاب کی پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں باقی مخطوطہ ہے۔ اس میں محیط برہانی (۷۰) ذخیرہ (۷۰) خانیہ (۲۲) اور ظہیریہ کو جمع کیا گیا ہے اس کا اصل نام زاد السفر ہے ۷۷۷ھ کی تصنیف ہے اور امیر تاتاخان کے نام سے معنون ہے، فیروز شاہ اپنے نام سے معنون کرانا چاہتا تھا مگر مصنف نے قبول نہیں کیا کیونکہ ان کی امیر مذکور سے دوستی تھی۔

۱۰۰- عصام بن یوسف، ابو عصمہ بلخی رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۰ھ) صاحبین اور ابن المبارک (۹۸) کے تلمیذ اور محمد بن سماعہ، ابن رستم اور ابو حفص کبیر بخاری کے معاصر ہیں۔ حدیث شریف میں سفیان ثوری امام شعبہ اور ابن المبارک سے روایت کرتے ہیں (لسان المیزان ج ۴ ص ۱۶۸ میں سن وفات ۲۱۵ھ لکھا ہے۔ شامی ج ۳، ص ۲۱۴۔ فوائد بہیہ ص ۴۸)

۱۰۱- ابن الشلبی احمد بن محمد السعودی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۲۱ھ) حنفی فقیہ ہیں، مصر میں قیام کر لیا تھا۔ آپ کی کتابیں یہ ہیں (۱) مجمع الفتاویٰ (اس کا مخطوطہ بصرہ میں ہے) (۲) مناسک الحج (۳) درر الفوائد (نحو کی کتاب ہے) (۴) اتحاف الرواۃ بمسلسل القضاۃ (اعلام ج ۱،

ص۲۳۶۔ ہدیۃ العارفین ج۱ ص۱۵۳۔ وفیہ المعروف بالشلبی)

۱۰۲- علامہ بدر الدین زرکشی، ابو عبداللہ محمد بن بہادر بن عبداللہ مصری رحمہ اللہ (و۷۴۵ھ ف۷۹۴ھ) شافعی فقہ و اصول کے بڑے عالم اور محدث ہیں۔ چند تصانیف یہ ہیں۔(۱) الاجابۃ لا یراد ما استدرکتہ السیدہ عائشہ علی الصحابہ (۲) لقطۃ العجلان وبلۃ الظمآن (اصول فقہ) (۳) اعلام الساجد باحکام المساجد (۴) البرہان فی علوم القرآن (یہ سب کتابیں مطبوعہ ہیں) (۵) البحر المحیط (اصول فقہ میں تین جلدوں میں ہے)(۶) التنقیح لالفاظ الجامع الصحیح (۷) قواعد الزرکشی المسمی بالمنثور وغیرہ بہت سی کتابیں ہنوز مخطوطہ ہیں (اعلام ج۶ ص۶۰۔ معجم المؤلفین ج۹ ص۱۲۱۔ کشف الظنون ج۱ ص۲۴۰)

۱۰۳- ابن الساعاتی علامہ مظفر الدین احمد بن علی بغدادی حنفی (متوفی ۶۹۴ھ) اصول فقہ میں آپ کا لکھا ہوا متن بدیع النظام الجامع بین کتابی البزدوی والاحکام للآمدی ہے۔ جس کی علامہ سراج الدین ابو حفص عمر بن اسحاق ہندی مصری حنفی (متوفی ۷۷۳ھ) نے شرح لکھی ہے(۹۷) جس کا نام کاشف معانی البدیع وبیان مشکلہ المنیع ہے، متن اور شرح دونوں مخطوطہ ہیں۔ مجمع البحرین آپ کی ہے۔

۱۰۴- علامہ ابن الملقن، سراج الدین، ابو حفص عمر بن علی ابن النحوی (و۷۲۳ھ ف۸۰۴ھ) ساتویں صدی کے مشہور محدث، اسمائے رجال کے بڑے عالم اور شافعی فقیہ ہیں ولادت و وفات قاہرہ میں ہوئی ہے۔ ایک سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا والدہ نے عیسیٰ مغربی سے نکاح کر لیا جو مکتب میں پڑھاتے تھے (لقن القرآن کے معنی ہیں بچوں کو قرآن کا ناظرہ پڑھانا) ان کے گھر میں پرورش پائی اس لیے ابن الملقن سے مشہور ہوئے مگر یہ عرف آپ کو ناپسند تھا وہ ابن النحوی کہلانا پسند کرتے تھے۔ آپ کی تقریباً تین سو تصانیف ہیں چند یہ ہیں اکمال تہذیب الکمال التذکرہ فی علوم الحدیث، التوضیح (شرح بخاری) شرح زوائد مسلم علی البخاری وغیرہ (دیکھیے اعلام ج۵ ص۵۷)

۱۰۵- ابن برہان، ابو الفتح احمد بن علی بن برہان بغدادی (و۴۷۹ھ ف۵۱۸ھ) پانچویں صدی کے شافعی فقیہ اور اصولی ہیں حل اشکال میں ضرب المثل تھے آپ کی اصول فقہ میں الاوسط ہے علاوہ ازیں البسیط، الوسیط اور الوجیز بھی فقہ اور اصول فقہ میں ہیں (اعلام ج۱

ص ۱۷۳۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۰۱)

۱۰۶۔ امام مزنی' ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ رحمہ اللہ (و ۱۷۵ھ ف ۲۶۴ھ) مصر کے باشندے امام شافعی رحمہ اللہ کے خاص شاگرد اور فقہ شافعی کے راوی ہیں۔ آپ کی کتاب مختصر المزنی مطبوعہ ہے علاوہ ازیں جامع کبیر' جامع صغیر اور ترغیب فی العلم بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔

۱۰۷۔ ابن سریج احمد بن عمر بغدادی رحمہ اللہ (و ۲۴۹ھ ف ۳۰۶ھ) مشہور شافعی فقیہ اور تقریباً چار سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی اشاعت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ شیراز کے قاضی رہے ہیں۔

۱۰۸۔ امام الحرمین' ابو المعالی' عبد الملک بن عبد اللہ جوینی رحمہ اللہ (و ۴۱۹ھ ف ۴۷۸ھ) پانچویں صدی کے مشہور شافعی فقیہ ہیں۔ جوین نیشاپور کے علاقہ میں ایک بستی ہے وہ مولد ہے پہلے بغداد پھر مکہ تشریف لے گئے اور چار سال قیام فرمایا' پھر مدینہ منورہ میں درس دیا پھر نیشاپور واپس لوٹے تو نظام الملک نے آپ کے لیے نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جس میں آپ درس دیتے تھے اور اکابر اس میں شرکت کرتے تھے آپ کثیر التصانیف ہیں۔ چند یہ ہیں۔ العقیدۃ النظامیہ البرہان (اصول فقہ میں) نہایت المطلب فی درایۃ المذہب (بارہ جلدوں میں فقہ شافعی میں) الشامل (علم کلام میں) الارشاد (علم کلام میں) الورقات (اصول فقہ میں) مغیث الخلق وغیرہ۔

۱۰۹۔ امام رافعی عبد الکریم بن محمد قزوینی رحمہ اللہ (و ۵۵۷ھ ف ۶۲۳ھ) مشہور شافعی فقیہ ہیں۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت ہے۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں (۱) فتح العزیز فی شرح الوجیز للغزالی (۲) التدوین فی ذکر اخبار قزوین (۳) المحرر (۴) شرح مسند الشافعی (۵) سواد العینین وغیرہ۔

۱۱۰۔ علی بن غانم مقدسی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۰۴ھ) حنفی فقیہ ہیں۔ آپ نے منظوم کنز الدقائق کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام اوضح رمز علی نظم الکنز ہے اور منظومہ ابن الفصیح احمد بن علی ہمدانی (متوفی ۷۵۵ھ) کا ہے جس کا نام مستحسن الطرائق ہے۔ یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۱۶)

۱۱۱۔ ابو اسحق ابراہیم بن یوسف بلخی رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۱ھ) امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے

خاص شاگرد ہیں حدیث شریف میں سفیان ثوری وغیرہ کے شاگرد ہیں' امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک حدیث روایت کرتے ہیں آپ عصام بن یوسف بلخی (۱۰۰) کے بھائی ہیں۔

۱۱۲- جامع المضمرات والمشکلات قدوری کی شرح ہے از صوفی یوسف بن عمر کادوری بزار رحمہ اللہ (متوفی ۸۳۲ھ) آپ کی شہرت "نبیرہ شیخ عمر" سے تھی' حنفی فقیہ ہیں۔ آپ کی قدوری کی شرح مخطوطہ ہے (کشف الظنون ج ۲' ص۱۶۳۲۔ اعلام ج ۸' ص ۲۴۴)۔

۱۱۳- ابن عبدالرزاق عبدالرحمٰن بن ابراہیم دمشقی رحمہ اللہ (و۱۰۷۵ھ ۱۱۳۸ھ) حنفی فقیہ ہیں آپ کی درمختار کی شرح مفاتیح الاسرار مخطوطہ ہے۔ علاوہ ازیں قلائد المنظوم (علم الفرائض میں) اور حدائق الانعام فی فضائل الشام بھی آپ کی کتابیں ہیں۔ (اعلام ج ۳' ص ۲۹۳)

۱۱۴- الطراز المذہب لاحکام المذہب فقہ شافعی کی کتاب ہے اور مخطوطہ ہے از علامہ شہاب الدین احمد بن یوسف حلوجی' سیرجی' مصری رحمہ اللہ (و۷۸۷ھ ف ۸۶۲ھ) آپ کی ایک کتاب مختصر شواہد الانقیہ للعینی بھی ہے۔ علم فرائض آپ کا خاص فن تھا (اعلام ج ۱' ص ۲۷۴ کشف الظنون ج ۲' ص ۱۱۰۹)

۱۱۵- خبازی' جلال الدین' ابو محمد عمر بن محمد خبازی خجندی دمشقی رحمہ اللہ (و۶۲۹ھ ف۶۹۱ھ) حنفی فقیہ ہیں۔ آپ نے ہدایہ کی شرح لکھی ہے اور اصول فقہ میں المغنی' جو دونوں مخطوطہ ہیں (اعلام ج ۵' ص ۶۳)

۱۱۶- تقی الدین سبکی علی بن عبدالکافی مصری رحمہ اللہ (و۶۸۳ھ ف ۷۵۶ھ) اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام بڑے مفسر' مناظر اور شافعی فقیہ ہیں' تاج الدین سبکی صاحب طبقات کے والد ماجد ہیں۔ سبک مصر کی ایک بستی ہے' آپ کثیر التصانیف ہیں چند یہ ہیں۔ التمہید فیما یجب فیہ التحدید۔ السیف الصیقل (ابن القیم کے قصیدہ نونیہ کا رد ہے) مجموعۃ الفتاویٰ (فتاویٰ السبکی سے بھی معروف ہے) شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام' السیف المسلول علی من سب الرسول وغیرہ۔

آپ کے صاحبزادے علامہ تاج الدین سبکی' قاضی القضات عبدالوہاب بن علی رحمہ اللہ (و۷۲۷ھ ف ۷۷۱ھ) ہیں جن کی مشہور کتاب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ مطبوعہ ہے۔ آپ کی دوسری کتابیں معید النعم ومبید النقم' جمع الجوامع (اصول فقہ میں) منع الموانع (جمع الجوامع کا حاشیہ) اور الاشباہ والنظائر وغیرہ ہیں۔

شخصیات

وہ حضرات جن کا کتاب میں تذکرہ آیا ہے اور حواشی میں ان کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کتاب میں یا حواشی میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ہماری چند دیگر
خوبصورت اور
معیاری مطبوعات
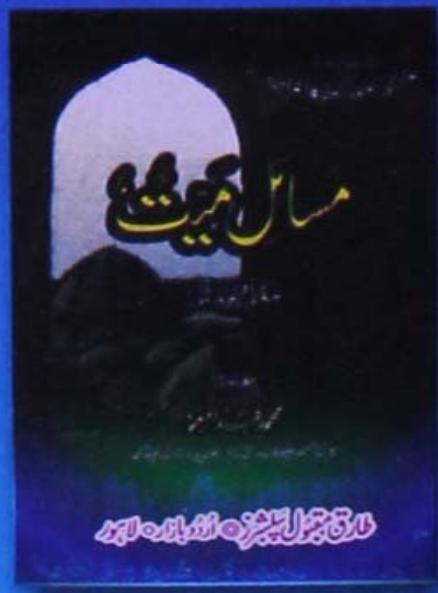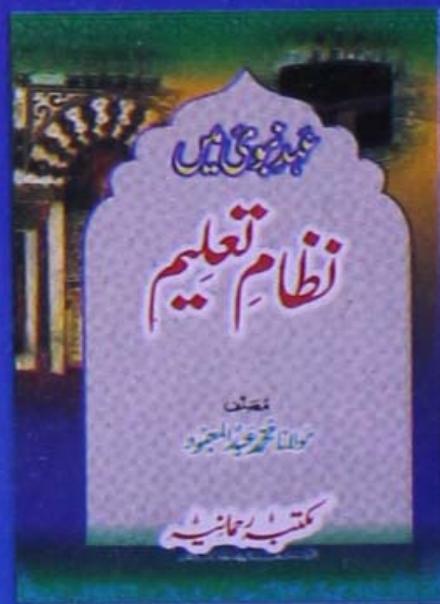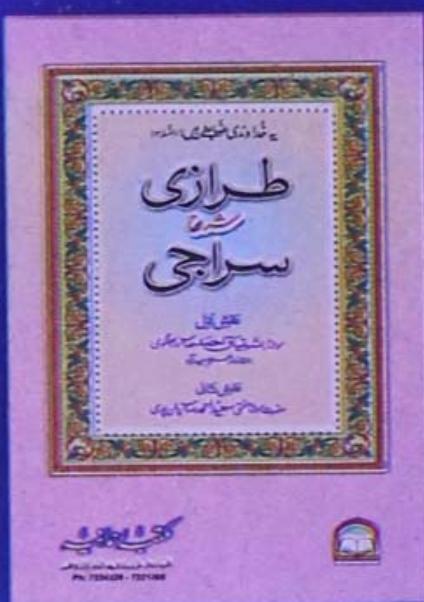
مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار
لاہور۔ پاکستان
Phone: 042 - 7224228